گیارہواں باب

فرار

رمضان کا پہلا روزہ، ویسا ہی تھا جیسا ہمیشہ ہوتا ہے۔ گھر بھر میں دوپہر سے افطاری کی تیاریاں جاری تھی۔ تایا نے تمام گھر والوں کو پہلا روزہ ساتھ افطار کرنے کی دعوت دی تھی۔ ایسے میں طویل راہداری کے درمیان میں بنے، گول کمرے کے دروازے کے کنارے سے لگی، وہ اپنی اونچی ہیلز کی مدد سے، اوٹ سے اندر جھانکنے کی تگ ودو میں تھی۔ کوشش فقط اتنی تھی کہ اندر بیٹھی بزرگ خواتین کا موضوع گفتگو معلوم کر لیا جائے۔ اس کوشش میں وہ کافی دیر سے بلکل روبوٹ بنی ہوئی تھی، ڈر تھا کہ کہیں کسی کی نظر نہ پڑ جائے۔ پیچھے سے آتا حسین اُسے دیکھ کر ٹھٹک کر رکا۔

''یہ کیا کر رہی ہے یہاں؟'' اُس نے بھنویں سکیڑ کر اُسے دیکھا، پھر احتیاط سے چلتے ہوئے اُسکے قریب پہنچا۔ اُسکا کندھا ہلا کر اشارے سے پوچھا کہ کیا ہوا؟

''ہش۔۔۔'' اُس نے ہونٹ پر انگلی رکھ کر اُسے چپ رہنے کو کہا اور دوبارہ دروازے سے اندر کی جانب دیکھنے لگی۔

اُسکے پیچھے کھڑے حسین نے کندھے اچکاتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھوں پر پھونک ماری، پھر اُنہیں آپس میں ملتے ہوئے ہوا میں بلند کیا، اور اگلے ہی لمحے حورعین کو دروازے کے اندر دھکّا دے دیا۔ وہ سنبھل بھی نہ سکی اور لڑکھڑاتے ہوئے سیدھا کمرے کے اندر۔۔۔

اُسکے اچانک نزول پر اندر بیٹھی خواتین نے گفتگو روک کر سر تا پیر اسے گھورا تو اُس نے گھبرا کر دانت نکالے۔

''وہ میں۔۔۔ میں بس۔۔۔۔ غلطی سے اِدھر آ گئی۔ آپ لوگ۔۔۔ جاری رکھیں۔۔۔ کیری آن پلیز۔۔'' دانت نکالتے ہوئے مزید وضاحت دی پر وہاں بیٹھی خواتین کو وہ ایک آنکھ نہ بھائی، لہٰذا اُس نے وہاں سے رفوچکّر ہونے میں ہی عافیت جانی۔

دوسری جانب اس تمام کارروائی سے لطف اندوز ہوتے حسین نے اُسے باہر آتا دیکھ کر دوڑ لگادی۔ حور صاحبہ نے بھی اپنی اونچی ہیل اُتاری اور تاک کر نشانہ لگایا۔ مگر حسین جیسے چابک رفتار کے آگے ہر نشانہ خطا ہو گیا اور حسین صاحب راہداری کے آخر میں بنے دروازے کے پیچھے گم ہو گئے۔

''دوبارہ اپنا منہ نہ دکھانا۔'' وہ وہیں سے چیخی۔ راہداری کے آخر میں بنا دروازہ کھلا اور حسین کا منہ نمودار ہوا۔

''کیوں میرا چہرہ دیکھنے سے تمہیں الرجی۔۔۔'' حور کو اپنی دوسری ہیل اتارتا دیکھ، اُسکے الفاظ منہ میں ہی رہ گئے۔ اُس نے ایک اور بار اُسکے سر کا نشانہ لیا پر اس بار بھی اُس نے برق رفتاری سے دروازہ بند کیا، تو اُسکی ہیل دروازے سے لگتی ہوئی زمین بوس ہو گئی۔

''گول۔۔۔'' دروازہ کھولتا حسین خوشی سے چہکا، پر اگلے ہی لمحے اُسے اپنی جانب بڑھتا دیکھ کر واپس بھاگ نکلا۔

''تمہیں تو میں چھوڑوں گی نہیں۔'' حور عین نے دروازہ کھولنا چاہا پر وہ باہر سے لاک کر چکا تھا۔ اب اُسے حسین کے قہقہوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

''حسین۔۔۔ دروازہ کھولو۔۔'' وہ چیخی۔

''آپ کون؟'' دروازے کی دوسری جانب سے اُسکی آواز سنائی دی تو تن بدن میں آگ لگ گئی۔

''آج تمہیں شربت میں مرچیں ملا کر دوں گی۔'' وہ پاؤں پٹختی وہاں سے چلی گئی۔ جبکہ اُسکے ہنسنے کی آواز راہداری میں گونجتی رہ گئی۔

---------+---------+--------

''کیا مطلب؟ کیا مطلب اس بات کا؟ کیا مطلب۔۔۔'' وہ حلق کے بل چیخ رہا تھا۔ کاؤنٹر پر بیٹھی خاتون کا خون خشک ہوا۔

''ہو سکتا ہے کہ آآ۔۔۔ آپ کی۔۔۔ بیٹی آج اسکول ہی نہ آئی ہو۔'' خاتون نے گڑبڑاتے ہوئے بھونڈی سی وضاحت دی۔

''کیا بکواس ہے یہ؟ میری بیٹی صبح اسکول آئی ہے۔ اُسکی حاضری بھی لگی ہے۔ پھر بریک کے بعد اُسکی حاضری کیوں نہیں ہے؟ کہاں گئی وہ؟'' اُس نے غصّے سے کھولتے ہوئے کاؤنٹر پر ہاتھ مارا تھا۔

''سر! آپ ایک خاتون سے اس طرح بات نہیں کر سکتے۔'' ساتھ کھڑی ٹیچر نے اُسے وارن کرنا چاہا۔ یہ نشمیہ کی کلاس ٹیچر تھی اور اسی نے بتایا تھا کہ وہ وقفے کے بعد سے غائب ہے۔

''میری بیٹی غائب ہے۔ آپکو اخلاقیات کی پڑی ہے؟ مجھے جواب چاہیے۔۔۔ کہاں ہے میری بیٹی؟'' اُسکا بس نہیں چل رہا تھا کہ سارا اسکول انکے سروں پر گرادے۔

''سر! ہو سکتا ہے کہ کوئی غلط فہمی ہوئی ہو۔ آپکی بیٹی آج اسکول آئی ہی نہ ہو۔ یا پھر آپکے گھر سے کوئی اُسے پہلے ہی۔۔۔''

''میری بیٹی اسکول کے علاوہ اور کہیں نہیں ہے۔ وہ یہیں آئی تھی اور اُسے یہیں ہونا چاہیے۔ مجھے میری بیٹی چاہیے اور اسکے علاوہ مجھے کچھ نہیں سننا۔'' وہ خاتون کی بات کاٹتے ہوئے دھاڑا تھا۔ لگ رہا تھا کہ دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی یا دل کام کرنا چھوڑ دے گا۔ وہ جو فقط ایک بچی تھی آج ''**میری بیٹی**'' ہو گئی تھی۔ وہ جسکے ہونے سے چڑ تھی، آج اُسکا نہ ہونا روح نکال رہا تھا۔

''آپ پریشان نہ ہوں۔ بچے اسکول سے کہیں نہیں جا سکتے۔ وہ یہی کہیں ہو گی۔ ہم اسکول کی تلاشی لیتے ہیں۔'' ایک میل ٹیچر نے کہا تھا۔ علی کی آواز سن کر اسکول کا بیشتر اسٹاف بھی وہاں آ گیا تھا۔

''مجھے اس بات کا جواب دو کہ بچی پچھلے ایک گھنٹے سے کلاس میں نہیں ہے نہ اُسکی حاضری لگی ہے، تو اتنی دیر سے تم لوگ سو رہے تھے؟'' اُس نے باآواز بلند پوچھا تھا۔

''کیا ہو رہا ہے یہاں؟'' شور شرابے میں اس آواز پر کسی کا بھی دھیان نہ گیا۔

''سر! میں کہہ رہا ہوں کہ آپکی بیٹی مل جائے گی، آپ غصّے پر قابو رکھیں۔'' مرد استاد نے بھی اس بار غصّہ دکھانا چاہا تھا۔

''اگر میری بیٹی نہیں ملی، میں جان لے لوں گا تم سب کی۔'' علی اُسکی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولا۔

''میں نے پوچھا کہ کیا ہو رہا ہے یہاں؟'' آنے والا اب کہ بلند آواز میں چیخا تھا۔ اس بار سب نے گردنیں موڑ کر اُسے دیکھا۔ اسٹاف کو تو اُسے دیکھ کر ہی خوف سے سانپ سونگھ گیا تھا۔ جبکہ علی حیرت سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

سیاہ جینز پر سرمئی شرٹ پہنے اور اُس پر ہم رنگ کیجول کوٹ ڈالے وہ وہی تھا۔۔۔

وہ جو اس اسکول کا مالک تھا۔۔۔

رضاالٰہی

---------+---------+--------

کچن میں بیسن اور تلی ہوئی سبزیوں کی مہک پھیلی ہوئی تھی، یہ سارا سامان افطاری کے لیے تیار کیا جارہا تھا۔ سموسے کی فلنگ تیار کرتی، وہ خود بھی آگ بگولا ہو رہی تھی۔

''بدتمیز۔۔۔آج تو بات ہی نہیں کروں گی اس سے۔۔۔''وہ ٹھیک ٹھاک تپی ہوئی تھی۔

''اہم۔۔۔اہم۔۔''کسی نے کاؤنٹر کے قریب کھڑے ہو کر گلا کھنکھارا تو اُس نے رک کر شعلہ بار نظروں سے دیکھا۔

''اپنی شکل گم کرلو۔''

''وہ تو میں گم کرلوں گا لیکن کہنا یہ تھا کہ میری بیگم لاپتہ ہو گئی ہیں۔آپ نے کہیں دیکھا ہے اُنہیں؟''حسین نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''تمہاری بیگم اپنی آدھی عقل والے شوہر سے تنگ ہے۔اس لیے تم اپنا منہ نہ ہی دکھاؤ اُسے تو اچھا ہو گا۔''تنک کر جواب دیتی وہ رول کی پٹیاں کھول کھول کر رکھنے لگی۔

''حالانکہ خود میری بیگم بنا عقل کے پیدا ہوئی ہے، لیکن نہ جانے غرور کس بات کا ہے؟''اس بات پر اُس نے کینہ توز نظروں سے اُسے دیکھا۔

''تمہاری بات نہیں کر رہا، میں تو اپنی دوسری بیوی کا ذکر کر رہا تھا۔''اُس نے ڈرنے کی اداکاری کی۔

''ہونہہ۔۔۔دوسری''اُس نے مذاق اڑاتے لہجے میں کہا۔

''انڈر اسٹیمیٹ (کم سمجھنا) مت کرو مجھے تم، ایک دن نکل آئیگی کہیں سے تمہاری سوکن، اُس دن احساس ہو گا کہ میں جھوٹا نہیں تھا۔''

''دیکھو! میرا روزہ ہے۔میرا دماغ مت کھاؤ۔''

''میں سڑی ہوئی چیزیں نہیں کھاتا۔اور تم اکیلی روزے سے نہیں ہو۔''

''تمہارا مسئلہ کیا ہے؟''اُس نے کاؤنٹر پر چمچ پٹختے ہوئے پوچھا۔

''میرا مسئلہ آپ ہیں حور عین بی بی! میرا پی ایس کہاں چھپایا ہے؟''وہ اصل مدعے پر آیا۔

''تایا ابّا نے کہا تھا کہ تمہیں ہر قسم کے فضول کاموں سے دور رہنا چاہیے اور اب ایک ذمے دار انسان بننا چاہیے۔''

''کہاں چھپایا ہے؟''اُس نے سوال پر زور دیا۔

''مجھے یاد نہیں۔۔۔یاداشت کمزور ہے میری۔۔۔'' اُس نے اداکاری میں اپنے میاں کو مات دینے کا سوچا۔

''تمہاری یاداشت تو واپس آجائیں گی جب میں تمہیں بتاؤں گا کہ ہم افطار کے بعد میری سالگرہ کی ویڈیو دیکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ہم یعنی پورا گھر اور بچے بھی۔۔۔''

''سالگرہ کی ویڈیو؟''پہلے تو وہ سمجھ نہ سکی۔

''وہ والی۔۔۔۔''حسین نے یاد دلانے کی کوشش کی۔

''وہ۔۔۔اچھا وہ والی؟''اُسے یکدم ہی یاد آیا۔

''ہاں! میری آٹھویں سالگرہ کی ویڈیو جس میں، میں نے تمہیں بال نوچ نوچ کر مارا تھا۔''اُس نے شرارت سے کہا۔

''تم ہو ہی وحشی۔۔۔بچپن سے۔۔۔''اُس نے تپ کر کہا۔ایک تو پتہ نہیں اسکے خاندان والوں کو ہر موقع پر ویڈیو بنوانے کا کیا شوق تھا؟

''اور تم ہو ہی قبضہ مافیا۔بچپن سے۔۔۔''اُس نے دوبدو جواب دیا۔

''میں نے کیا قبضہ کیا؟''

''سالگرہ میری، کیک میرا، دن میرا اور مجھ سے پہلے موم بتیاں بجھانے کی اجازت کس سے لی تھی تم نے؟''اُس نے غم زدہ لہجے میں پوچھا۔

''تو؟ میں اُس وقت ایک پانچ سالہ بچی تھی، تم اتنی سی بچی کا ذرا سا دل نہیں رکھ سکتے تھے؟''اُس نے بچپن والی حور کا دفاع کیا۔

''جو بھی ہو، مزا بڑا آیا تھا۔ بال نوچ نوچ کر مارا تھا میں نے تمہیں۔'' وہ جیسے یاد کر کے، ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہنسا تھا۔ حور عین کو آگ ہی لگ گئی۔

''بے شرم نہ ہو تو۔۔۔''

''خیر! اب میں وہ ویڈیو باقی سب کے سامنے چلانے لگا ہوں۔'' وہ بول کر جانے لگا، یہ ویڈیو جب چلتی خاندان بھر میں اُس کا مذاق بنتا تھا۔

''دے دوں گی پی ایس۔۔۔'' وہ فوراً لائن پر آئی۔

''لیکن میں بھی کھیلوں گی۔'' ساتھ شرط بھی رکھی دی۔

''ٹھیک ہے! تراویح کے بعد۔۔۔'' ڈیل ہو گئی۔ اُسی لمحے حسین کا فون بج اٹھا۔ اُس نے دیکھا تو سکرین پر رضا کالنگ کے الفاظ جگمگا رہے تھے۔

---------+---------+--------

سیاہ جینز پر سرمئی شرٹ پہنے اور اُس پر ہم رنگ کیجول کوٹ ڈالے کھڑا رضا، اُن دونوں کو نا سمجھی اور غصّے کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔

''کیا ہو رہا ہے اشتیاق صاحب؟'' اُس نے استاد کو مخاطب کیا۔ علی کو تو اب تک اُسکے یہاں ہونے کا جواز ہی سمجھ نہیں آیا تھا، کجا کہ یہ کہ وہ سب سے سوال بھی کر رہا تھا۔

''سر! یہ کسی بچی کے والد ہیں اور مسلسل اسٹاف کو حراساں کر رہے ہیں۔'' اُنہوں نے جواب دیا۔

''کیا بکواس کر رہے ہو؟'' اس جھوٹ پر تو علی نے اُسکا گریبان ہی پکڑ لیا۔

''آپ حد میں رہیں اپنی۔۔۔'' اشتیاق صاحب کو موقع مل گیا تھا مظلوم بننے کا۔

''علی! چھوڑو اُسے۔۔'' رضا نے درمیان میں آ کر اُسے دور ہٹایا۔

''کیا کر رہے ہو تم یہ؟''اُسے پیچھے ہٹاتے ہوئے غصّے سے پوچھا۔اُسکے انداز پر اسکول کے باقی استاد چونکے،یقیناً رضا اُس بچی کے باپ کو جانتا ہے۔

''سر! یہ مسلسل اسی طرح بدتمیزی۔۔۔''علی سے پہلے اشتیاق صاحب نے بولنا چاہا۔

''میں نے آپ سے نہیں پوچھا۔''رضا اُنکی بات کاٹ کر سختی سے بولا تھا۔

''بتاؤ مجھے کیا ہوا ہے آخر؟''اب کہ اُسکا صبر جواب دے گیا۔

''تمہیں کیوں بتاؤں میں؟''علی بھی جھنجھلائے ہوئے انداز میں چیخا تھا۔رضا نے خون کے گھونٹ بھرے۔

''کیونکہ میں اس اسکول کا مالک ہوں اور تم میرے اسکول میں یہ تماشا لگا رہے ہو۔''اُس نے لفظ میرے پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''اوہ! تو یہ تمہارا اسکول ہے؟''اُسکے چہرے پر حیرت کی جگہ طنز نے لے لی تھی۔

''تو پھر تم ہی بتاؤ کہ میری بیٹی کہاں ہے؟''اُسکا بس نہیں چل رہا تھا کہ رضا کو ہی پیٹنا شروع کر دے۔

''تمہاری بیٹی؟''وہ سمجھا نہیں۔

''ہاں! میری بیٹی نشمیہ،جو صبح اسکول آئی تھی اور گیارہ بجے کے بعد اُسکی کوئی حاضری ہی نہیں ہے۔اور تمہارے اسکول والے مجھے یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ میری بیٹی کہاں ہے؟''بولتے بولتے اُسکا سانس پھول گیا تھا۔رضا کی آنکھوں میں بے یقینی اُتر آئی۔وہ جھٹکے سے نشمیہ کی ٹیچر کی طرف مڑا۔

''کیا کہہ رہا ہے یہ؟''اُس نے سرد لہجے میں ٹیچر سے پوچھا تو وہ گڑبڑا گئی۔

''سس۔۔۔سر! وہ ہو سکتا ہے کہ کوئی لے گیا ہو گھر والوں میں سے۔۔۔''ٹیچر نے وہی وضاحت دینے چاہی۔

''بچی غائب ہے۔۔۔۔میرے خدا! بچی اسکول سے غائب ہے اور آپ لوگ اُسے تلاشنے کے بجائے یہاں کھڑے تماشا لگا رہے ہیں؟''اُسکی ایک دھاڑ پر سب کی بولتی بند ہوئی تھی۔

''اسکول کا ہر کمرہ، ایک ایک کونا دیکھو جا کر، واشروم اور پلے گراؤنڈ بھی دیکھو۔ بچی ہر صورت ملنی چاہیے۔ ورنہ تم سب سے حساب لوں گا۔'' وہ چیخ رہا تھا اور اسٹاف نشمیہ کی تلاش میں دوڑ رہا تھا۔

''نشمیہ نام ہے اُسکا۔۔۔'' علی نے جتایا، رضا نے نظر انداز کیا۔

''اور آپ؟'' اُس نے ٹیچر کو مخاطب کیا۔ ''نشمیہ کی کلاس ٹیچر ہیں ناں آپ؟ جب وقفے کے بعد اُسکی حاضری نہیں لگی تو آپ کہاں تھیں؟ آپ نے فوراً انتظامیہ کو خبر کیوں نہیں کی؟''

''سر!۔۔۔ میں نے۔۔۔ میں نے دھیان نہیں دیا۔''

''دھیان نہیں دیا؟ مذاق کر رہی ہیں آپ؟'' رضا کے بجائے علی بولا تھا۔

''اس غفلت کا حساب میں آپ سے بعد میں لوں گا، تم میرے ساتھ آؤ علی!'' رضا نے پہلے اُسے اور پھر علی کو مخاطب کیا۔

''کہاں؟''

''اسکول کی سی سی ٹی وی دیکھتے ہیں۔ میرے اسکول سے کوئی بچہ باہر نہیں جا سکتا۔ وہ یہیں کہیں ہو گی۔'' اُس نے تسلی آمیز لہجے میں کہا تو وہ سر ہلاتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

''سر! بچی اسکول میں کہیں نہیں ہے، البتہ اُسکا بیگ اور باقی سامان کلاس میں ہی موجود تھا۔'' وہ لوگ ایڈمن آفس میں تھے، جب کچھ ہی دیر میں اسٹاف مایوس چہروں اور ہاتھوں میں اُسکا بستہ و دیگر سامان تھامے واپس آ گیا، نشمیہ کہیں نہیں ملی تھی۔

''نہیں ہے؟ کیا مطلب نہیں ہے۔'' علی کا تو بس ہی نہیں چل رہا تھا ورنہ اُن سب کو باری باری گولی مار دیتا۔

''علی! ہم کیمرے دیکھ رہے ہیں۔ مل جائیگی نشمیہ۔۔۔ ریلیکس!'' رضا نے اُسے سمجھانا چاہا، چیخ چیخ کر اُس کا چہرہ لال ہو چکا تھا۔

''نہیں کر سکتا میں ریلیکس۔۔۔ میری بچی غائب ہے۔ کیوں سمجھ نہیں آ رہی تمہیں؟'' اُسکا گلا رندھ گیا۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا اُسکی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی، فشار خون الگ بلند ہو رہا تھا۔ رضا نے افسوس سے اُسے دیکھا، ذرا جو یہ شخص تھوڑا صبر سے کام لے لے۔۔۔

''سر! کیا یہ ہے بچی؟'' یکدم ہی کمپیوٹر کے سامنے بیٹھے لڑکے نے پوچھا تو دونوں تیزی سے آگے بڑھے۔ علی نے جھک کر اسکرین میں دیکھا، تو وہ نشمیہ ہی تھی۔ صبح پونے گیارہ بجے کے وقت وہ پلے گراؤنڈ میں بچوں سے الگ تھلگ بیٹھی نظر آ رہی تھی۔

''ہاں! یہی ہے۔''

''ریکارڈنگ پوری چلاؤ۔'' رضا نے فوراً کہا تو اس نے ریکارڈنگ چلا دی۔ اب وہ لوگ سانسیں روکے دیکھ رہے تھے۔ وقفہ ختم ہونے کے بعد ٹیچر میدان سے بچوں کو اکھٹا کرنے لگیں، تب وہ کسی جھاڑی کے پیچھے چھپ گئی۔ پھر میدان خالی ہو جانے کے بعد کچھ دیر وہ وہیں بیٹھ کر روتی رہی۔ علی کے دل کو دھکّا لگا۔ وہ رو رہی تھی۔۔۔

اور ٹھیک گیارہ بجے کے وقت جب گارڈ دروازے پر نظر نہ آیا، تب نشمیہ اسکول کے دروازے سے باہر نکل گئی۔ اور پھر اُسے سڑک پر پیدل جاتے ہوئے دیکھا جا سکتا تھا۔ اُسکے آگے سی سی ٹی وی کی حد ختم ہو گئی۔ علی کے تو پیروں تلے زمین نکل گئی تھی۔ رضا نے حیرت اور بے یقینی سے اپنے اسٹاف کو دیکھا۔

''یہ کس قسم کی غفلت ہے؟ ٹیچر کو بچی کا معلوم نہیں ہے اور گارڈ دروازہ کھلا چھوڑ گیا ہے۔ آخر آپ لوگ کر کیا رہے تھے؟'' وہ اسٹاف پر حلق کے بل چیخ رہا تھا۔ سب کو سانپ سونگھا ہوا تھا۔

''وہ گیارہ بجے اسکول سے نکلی تھی۔۔۔'' علی بڑبڑایا، رضا کی دھاڑتی آواز میں کسی نے اُس پر توجہ نہیں دی۔

''جب تک بچی نہیں مل جاتی، کوئی کہیں نہیں جائے گا۔'' وہ چیخ رہا تھا۔

''ڈیڑھ گھنٹہ ہو گیا۔۔۔ وہ کہاں گئی؟'' علی نے خود سے سوال کیا۔ اور اسکے جواب میں سوائے خاموشی کے کچھ نہ سنائی دیا۔ اُسکے پاؤں کانپے، سر ایک لمحے کے لیے گھوما تو وہ لڑکھڑاتے ہوئے پیچھے کی جانب ہوا۔ وہ گر جاتا اگر رضا تیزی سے اُسکا بازو پکڑ کر اُسے پاس رکھی کرسی پر نہ بٹھا دیتا۔

''علی!۔۔۔ تم ٹھیک ہو؟'' وہ پریشان ہوا۔ اُس کا چہرہ خطرناک حد تک سرخ ہو رہا تھا، تنفس پھولا ہوا تھا۔

''علی!'' رضا نے اُسکا کندھا ہلایا۔

''میں کہاں ڈھونڈوں اُسے ؟''اُس نے نظریں اٹھا کر پریشانی سے اُسے دیکھا۔ پہلی بار رضا کو اُس پر ترس آیا۔

''ہم علاقے کی سی سی ٹی وی نکلواتے ہیں، آگے ٹریفک پولیس کا آفس ہے، وہیں چلتے ہیں۔''رضا نے اُسے کہا۔

''ہاں !۔۔۔ہاں ! یہ ٹھیک ہے۔ لیکن۔۔۔ لیکن وہ مل جائے گی ؟''علی نے پُر اُمید لہجے میں پوچھا۔

''ہاں ! ان شاءاللہ ضرور مل جائیگی۔''اُس نے یقین دلایا۔

''یہ سب۔۔۔''وہ رکا، پھر رضا کو دیکھا، آنکھوں میں یکدم ہی غصّہ اترا۔''یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔''وہ غصّے سے کہتا کھڑا ہوا۔ رضا بھونچکا رہ گیا۔

''میری وجہ سے ؟''وہ حیران ہوا۔

''ہاں ! تمہاری نااہلی اور لاپرواہی کی وجہ سے۔۔۔''غصّے سے کہتا وہ اسکول سے باہر نکل گیا۔ رضا ہکا بکا کھڑا تھا۔

''اتنا بڑا اسکول کھول رکھا ہے پر چلانا نہیں آتا۔ ایک بچی باہر نکل۔۔۔''اُسکے بڑبڑانے کی آواز اب بھی آرہی تھی، رضا نے لب بھینچے۔

''اس آدمی کے ساتھ عزت سے بات ہی نہیں کرنی چاہیے۔''دل میں سوچا۔ پھر خونخوار نظروں سے اسٹاف کو دیکھا۔

''اس مجرمانہ غفلت کا حساب میں واپس آکر لوں گا۔''علی کا غصّہ اُن پر اُتار کر وہ اسکول سے باہر آگیا۔ وہ پارکنگ میں کھڑا گاڑی کا دروازہ کھول رہا تھا۔

''میرے ساتھ آؤ ! میں ٹریفک پولیس کے آفس ہی جارہا ہوں۔''اُس نے علی کے پاس آتے ہوئے کہا۔

''کیوں ؟''کینہ توز نظروں سے اُسے دیکھا۔

''کیوں کہ راستے میں کہیں گاڑی ماردی تو سارا وقت وہیں برباد ہو جائیگا۔ باقی تمہاری مرضی۔۔۔''وہ بھی غصّے سے کہتا اپنی گاڑی کی طرف آگیا۔ علی کچھ دیر کھڑا سوچتا رہا، جبکہ وہ گاڑی میں بیٹھا اُسے ہی دیکھتا رہا۔ بلآخر علی دروازہ بند کر کے اُسکی گاڑی میں آگیا۔ وہ آگیا تو رضا نے سکھ کا سانس لیتے گاڑی سٹارٹ کر دی۔

''کتنی دور ہے آفس؟''علی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا تھا۔

''قریب ہی ہے، جلد پہنچ جائیں گے۔''اُس نے ضبط سے جواب دیا۔

''تیز چلاؤ۔۔۔''

''تمہارا روزہ ہے؟''رضا نے یکدم ہی پوچھا۔

''نہیں! کافر ہوں میں۔''ٹرختا ہوا جواب آیا، تو اب کہ رضا کا ضبط بھی جواب دے گیا۔

''روزہ ہے تو کم از کم اُسی کا لحاظ کر لو۔ اتنا چیخو گے تو افطار تک پانی نہیں ملے گا۔''اُس نے بھی دوبدو جواب دیا۔

''میری بیٹی گم ہو چکی ہے۔ تمہیں افطار کی پڑی ہے؟''وہ چیخا۔

''تو تمہاری بیٹی بھی تو اسکول سے خود نکلی ہے، اور وہ بھی پوری پلاننگ سے۔۔۔''اُس کی بس ہو گئی تھی۔

''گاڑی روکو! مجھے تمہارے ساتھ آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔''رضا نے واقعی گاڑی روک دی۔ اُس نے بے یقینی سے دیکھا۔

''تمہارے جتنا بدلحاظ نہیں ہوں۔ آفس آ گیا ہے، اترو!''اُس نے اس کی نظروں کا مفہوم سمجھ کر جواب دیا اور دروازہ کھولنے لگا۔ علی بھی لب بھینچ کر تیزی سے گاڑی سے اتر گیا۔

''پتہ نہیں اندر جا کر کیا تماشہ کرے یہ؟ مجھے حسین کو بلانا چاہیے۔''رضا نے سوچا۔ وہ اس آدمی کو اکیلا نہیں سنبھال سکتا تھا اور اس وقت موزوں شخص حسین ہی لگا۔ وہ گاڑی سے باہر آیا اور فون پر حسین کا نمبر تلاشتے علی کے پیچھے چلنے لگا۔ اس سے پہلے کے وہ حسین کو فون کرتا، آگے چلتے علی کا فون بج اٹھا، اُس نے رک کر جیب سے موبائل نکالا تو، رضا بھی اُسکے پاس ہی آ رکا۔ سکرین پر عمر کالنگ لکھا نظر آ رہا تھا۔ علی نے گھوم کر رضا کو دیکھا اور عجلت میں موبائل اُسکے ہاتھ میں تھماتا بولا۔

''تم بات کرو!''اور تیزی سے آگے بڑھتا اُسکا جواب سننے کے لئے رکا نہیں۔

''میں تو نوکر ہوں اسکا۔''اُس نے جل کر سوچا اور پھر فون ریسیو کر کے کان سے لگایا۔

''ہیلو!'' وہ فون کان سے لگائے آگے بڑھنے لگا، علی دور سے اُسے، سی سی ٹی وی مانیٹرنگ ہیڈ سے بات کرتا نظر آرہا تھا۔

''رضا؟'' عمر نے لمحوں میں اُسکی آواز پہچانی تھی۔ وہ حیران رہ گیا۔

''ہاں! میں رضا ہی بات کر رہا ہوں۔'' وہ ایک ستون کے پاس ٹیک لگائے کھڑا ہو گیا۔

''علی اپنی بیٹی کو لینے اسکول گیا تھا، اب تک آیا نہیں تو میں نے اُسے فون کیا پر۔۔۔ اُسکا فون تمہارے پاس کیا کر رہا ہے؟'' وہ حیران ہوا۔ جواباً اُس نے مختصراً تمام معاملہ اُسکے گوشِ گزار کر دیا۔ علی اب اُن سے کچھ بحث کرتا نظر آرہا تھا۔

''یا اللہ! اُسکی بیٹی تو بہت چھوٹی ہے۔ ایسے کہاں جا سکتی ہے بھلا؟'' عمر حقیقتاً پریشان ہوا۔

''اللہ بہتر جانتا ہے۔ ہم تلاش تو کر رہے ہیں۔'' اُس نے اتنا ہی کہا۔

''علی کیا کر رہا ہے ابھی؟'' اُس نے پوچھا۔

''میرے قتل کے سب سے اذیت ناک طریقے پر غور۔۔۔'' اُس نے جواب دیا۔ عمر مسکرا بھی نہ سکا۔

''وہ یقیناً غصّے میں ہو گا اس وقت۔۔۔ تم اُسکی کسی بات کا برا نہ ماننا۔'' اُسکی ہمیشہ دوسروں کی فکر کرنے والی عادت۔

''میں کسی بات کا برا نہیں مانتا۔ پر میں اُسے اکیلا سنبھال بھی نہیں سکتا۔ فلحال تو حسین کو بلا رہا ہوں کیونکہ میری بات تو یہ سنتا نہیں ہے۔''

''میں وہاں آؤں کیا؟''

''یہاں نہیں! اگر نشمیہ کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہوا تو اُسکے بعد ہم علی کے گھر جائیں گے۔ اس اُمید پر کہ کیا پتہ وہ کسی کو مل گئی ہو اور اُس نے گھر پہنچا دیا ہو۔ آس پاس کے علاقوں میں بھی دیکھیں گے۔ تم آنا چاہو تو اُسکے گھر ہی آجاؤ۔'' اُس نے وہ منصوبہ بتایا جو اُس نے کھڑے کھڑے، خود ہی ترتیب دیا تھا۔ علی کا اس سے کوئی تعلق نہ تھا۔ بھلے سے نہ ہو۔۔۔ فرق کسے پڑتا تھا؟

''ٹھیک ہے! میں آتا ہوں۔'' اُس نے کہا اور پھر فون کاٹ دیا۔ رضا فون لیکر علی اور ٹریفک پولیس ہیڈ کے پاس آیا۔

''جناب! میں نے کہہ دیا ہے، ریکارڈنگ نکلنے میں وقت لگے گا۔ آپ کو انتظار کرنا ہو گا۔'' ہیڈ شائستہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''میں انتظار نہیں کر سکتا، جلدی کیجئے پلیز!''اُس کا لہجہ ملتجی ہوا۔

''آپ یہاں آنے کے بجائے پولیس اسٹیشن جاتے تو زیادہ بہتر تھا۔ آپ کے پاس اب بھی وقت ہے، بچی کی تصویر دیں ہم قریبی تھانوں میں بھجوا دیتے ہیں۔ اُسکے علاوہ گشت پر مامور پولیس کو بھی کہہ دیں گے کہ بچی جہاں ملے فوراً آپ سے رابطہ کریں۔''اُسکی بات درست تھی۔

''یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ تم نشمیہ کی تصویر انہیں دے دو تاکہ وہ جلد سے جلد مل جائے۔''رضا نے فون اُسکی جانب بڑھاتے ہوئے آفیسر کی بات کی تائید کی۔ علی نے خالی الذہنی سے موبائل تھاما۔ کتنی ہی دیر وہ موبائل ہاتھوں میں تھامے دیکھتا رہا پر بولا کچھ نہیں۔

''علی! تصویر دو انہیں۔''رضا نے اُسے دوبارہ مخاطب کیا۔

''میرے پاس۔۔۔ نہیں ہے۔''اُس نے آہستہ سے کہا۔

''کیا نہیں ہے؟''وہ سمجھا نہیں۔

''میرے پاس تصویر نہیں ہے۔''اُس نے دوبارہ بتایا۔

''نشمیہ کی؟''اُسے یقین نہ آیا۔

''ہاں! ہاں! نشمیہ کی۔۔۔''وہ جھنجھلایا۔

''ایسے کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟ تمہارے پاس تمہاری بیٹی کی ایک بھی تصویر نہیں ہے؟''رضا کو بھی غصّہ آیا۔

''ہاں! نہیں ہے میرے پاس ایک بھی تصویر۔۔۔ سمجھ آئی تمہیں؟''وہ غصّے سے بولتا کمپیوٹر کے سامنے بیٹھے آفیسر کے سر پر جا کھڑا ہوا۔

''آخر اتنی دیر کیوں کر رہے ہو تم؟ صرف گیارہ بجے کی ریکارڈنگ ہی تو نکالنی ہے۔''وہ اب اس پر چیخ رہا تھا۔ صاف رضا کی نظروں سے بچنا چاہتا تھا جو مشکوک سا اُسے ہی گھور رہا تھا۔

''سر! خدا کے لیے انہیں کہیں کہ سکون سے بیٹھ جائیں اور ہمیں ہمارا کام کرنے دیں۔''ہیڈ نے آہستہ آواز میں رضا سے کہا۔

''اُسکی بیٹی لاپتہ ہے، میں اُسے سکون سے بیٹھنے نہیں کہہ سکتا۔ آپ ہی کچھ دیر کے لیے برداشت کر لیں۔''اُس نے جواب دیا اور ذرا کنارے آکر موبائل پر اپنے اسکول کی انتظامیہ کو نشمیہ کی تصویر بھیجنے کی ہدایت دینے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ اسکول کے ڈیٹا سے اُسکی تصویر مل ہی جائے گی۔ اُنہیں ہدایت دینے کے بعد اُس نے حسین سے رابطہ کیا اور مختصراً اُسے تمام بات بتادی۔ اُس نے فوراً آنے کے لیے حامی بھری تو اُس نے کال کاٹ دی۔ اُس وقت تک اُسکے پاس نشمیہ کی تصویر آچکی تھی۔ اُس نے ایک نظر غصّے سے بے قابو ہو کر، ٹریفک پولیس پر گرجتے برستے علی پر ڈالی، پھر دوبارہ موبائل پر کچھ ٹائپ کرنے لگا۔ اب وہ جانتا تھا کہ آگے کیا کرنا ہے۔

---------+--------+-------

ایف آئی اے کے آفس میں اِس وقت کافی گہما گہمی مچی ہوئی تھی۔ سائبر کرائم ڈیپارٹمنٹ والوں نے آج ٹھیک ٹھاک آنلائن فراڈیوں اور اسکامرز کو پکڑا تھا۔ اور اُن سے سب کچھ اگلوانے کے لیے سی ٹی ڈی والوں سے مدد مانگی گئی تھی، ایسے دنوں کا تو فیصل اور شیراز انتظار کرتے تھے۔

''اتنا تشدد مت کر دینا کہ وہ زندہ ہی نہ بچے۔''نوید نے اُن دونوں کو پرجوش دیکھ کر متنبہ کرنا چاہا۔

''نہیں بس! ایک آدھ ہڈیاں ہی توڑنے کا ارادہ ہے۔''فیصل نے اپنا ارادہ بتایا تو نوید نے تاسف سے دیکھا۔

''اگر وہ سچ بتادیں تو ہڈیاں بھی توڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔''اُس نے پھر ٹوکا۔

''لیکن ان میں سے ایک شخص لڑکیوں کی جعلی تصاویر بنا کر اُنہیں ہراساں کرتا تھا۔ کیا اُسکی ہڈیاں بھی چھوڑ دیں؟''شیراز نے پوچھا تو نوید کے ماتھے پر بل پڑے۔

''اُسکے علاوہ۔۔۔''مختصر جواب دیا تو دونوں کا منہ لٹک گیا۔ بھلا ہڈیاں نہ توڑنے میں بھی کوئی مزا ہے؟ نوید نے دونوں کے اترے چہرے دیکھے۔

''کیا ملتا ہے لوگوں پر اتنا تشدد کر کے؟ انسان کو سدھرنے کا موقع دینا چاہیے، اگر اتنا تشدد کر دو گے تو وہ اچھے اعمال کرنے کے لائق ہی نہیں بچے گا۔ بہت غلط بات ہے۔ کسی پر اتنا تشدد نہیں کرنا چاہیے، میں سخت خلاف ہوں اس چیز کے۔۔۔''آس پاس میزوں پر کام کرتے

افسران، مجرموں کو لیجاتے پولیس والے، اپنے کمرے کی سربراہی کرسی پر بیٹھے فرخ صاحب، حتیٰ کے لاک اپ میں عارضی طور پر بند پرانے مجرمین نے بھی رک کر، آنکھیں پھاڑ کر اور پلکوں کو جھپکا جھپکا کر نوید کو دیکھا تھا۔ یقیناً وہ مذاق کر رہا تھا۔

''میں نے یقین کر لیا۔'' شیراز نے مذاق اڑایا، پر نوید کی سنجیدہ شکل دیکھ کر واپس سیدھا ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا، اُسکا موبائل بج اٹھا۔ اُس نے حیرت سے موبائل اٹھا کر دیکھا، رضا کی کال آ رہی تھی۔ اُن دونوں کو جانے کا اشارہ کر کے اُس نے موبائل کان سے لگایا۔

''ہیلو!'' محتاط انداز میں پوچھا۔ پتہ نہیں کیا بات کرنی ہو گی؟

''ہیلو! کیا تم مصروف ہو؟'' دوسری جانب سے پوچھا گیا۔

''فارغ بھی نہیں ہوں۔'' جواب بہت عجیب سا تھا۔

''مجھے ایک کام ہے۔'' رضا بھی ڈھیٹ تھا۔

''بولو!''

''علی کی بیٹی صبح گیارہ بجے سے لاپتہ ہے۔ اُسے ڈھونڈھنے میں تمہاری مدد درکار ہے۔'' اگلے لمحے وہ جھٹکا کھا کر سیدھا ہوا۔

''نشمیہ؟'' اُس نے پوچھا۔

''ہاں! تم جانتے ہو؟'' رضا حیران ہوا۔

''وہ کیسے لاپتہ ہوئی؟'' اُس نے سوال نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ جواباً رضا نے ساری تفصیل بتا دی۔

''ٹھیک ہے! تم اُسکی تصویر بھیج دو، میں پولیس کو الرٹ کرتا ہوں۔ علی کہاں ہے؟ وہ کیا کر رہا ہے؟'' اُسے بھی پہلی فکر علی کی ہوئی، رضا نے ایک نظر سامنے ٹریفک پولیس آفیسر کے سر پر کھڑے، اُس سے بھڑتے علی کو دیکھا۔

''شدید غصّے میں ہے۔'' مختصر جواب دیا۔

''تم پر؟''

''ساری دنیا پر۔۔۔''

''تمہیں وہ کچھ بھی کہے تو نظر انداز کر دینا۔''اُس نے بھی وہی کہا جو عمر نے کہا تھا۔

''اُسکا بس نہیں چل رہا کہ اسکول کی بلڈ نگ کو باہر سے تالا ڈال کر آگ لگا دے۔اینڈ ہی ول میک شیور کہ میں بلڈ نگ کے اندر ہی موجود ہوں۔(اور وہ یہ تسلی کریگا کہ میں عمارت کے اندر ہی موجود ہوں)''اُس نے سکون سے کہا تو نوید کو معاملے کی سنگینی کا احساس ہوا۔

''اگر ٹریفک پولیس سے کوئی خاطر خواہ معلومات نہ ملے تو تم اُسے گھر لے جانا، میں وہیں آتا ہوں۔''اُس نے ہدایت دی۔

''ٹھیک ہے۔''رضا نے فون کاٹ دیا۔پھر اگلے لمحے نشمیہ کی تصویر اُسے بھیج دی۔

''اے ایس پی فیصل!۔۔۔''اُس نے آواز دی۔

''جی سر!۔۔۔''وہ فوراً آیا۔

''میں تمہیں ایک بچی کی تصویر دے رہا ہوں، یہ صبح گیارہ بجے سے لاپتہ ہے۔اسکی تمام ڈیٹیل بھی تمہیں بھیج رہا ہوں۔جلد سے جلد اس بچی کو ڈھونڈنے کے لیے ٹیم بھیجو۔''

''ٹھیک ہے سر! ٹیم ہی بھیجنی ہے ناں؟'' اُس نے پوچھا۔

''نہیں! تم بھی ساتھ جاؤ گے۔''نوید نے سنجیدگی سے کہا تو اُسکا چہرہ پھر سے اُتر گیا۔

''کیا یار!''وہ بیزار ہوا۔اچھا بھلا تشدد کا موقع ہاتھ سے نکل گیا۔

''جلدی۔۔۔''نوید کہتے ہوئے سامان سمیٹنے لگا تو وہ بھی جانے کے لیے مڑا۔

''اُس ہراسانی کے مجرم کی ہڈیاں، میرے لیے باقی رکھنا۔''جاتے جاتے فیصل، شیراز کو یاد دلانا نہیں بھولا۔وہ جواباً اُسکا منہ چڑاتا مجرم کے کمرے کی طرف چلا گیا۔جبکہ نوید آفس سے باہر نکل چکا تھا۔

---------+---------+--------

وہ پوش علاقہ تھا۔ آس پاس بنے گھر خوبصورتی میں اپنی مثال آپ تھے۔ درمیان میں موجود سڑک کشادہ اور صاف ستھری تھی، معلوم ہوتا تھا کہ سوسائٹی کی صفائی ستھرائی کا بہت خیال رکھا جاتا ہے۔ گھروں کے باہر کیاریوں میں مختلف اقسام کے قد آور درخت تھے، جو سڑک کی دونوں جانب قطار میں سایہ فگن تھے۔ روزہ رکھ کر ساری مخلوق خدا سوئی پڑی تھی، نہ روزے کا مقصد پتہ نہ عبادت کا شوق دل میں۔ بس سارا دن سونے کو ہی عبادت سمجھ کر اپنا روزہ پورا کرنے والی مخلوق اس بات سے انجان تھی کہ اس سڑک پر کھڑے دو وجود آپس میں بار بار کیوں اُلجھ رہے ہیں؟ لیکن ان دو کے ساتھ کھڑے باقی تین اچھے سے جانتے تھے کہ ان دو نفوس کا معاملہ اور مسئلہ کیا ہے؟

''اگر سی سی ٹی وی سے کچھ نہیں مل سکا تو اس میں، میں کیا کر سکتا ہوں؟'' بیچ سڑک پر کھڑا رضا جھنجھلایا۔ وہ لوگ علی کے گھر کے باہر کھڑے تھے۔ عمر اور مقدّم وہاں پہلے پہنچ چکے تھے، جبکہ حسین ٹریفک پولیس کے آفس سے ہی اُنکے ساتھ آیا تھا۔

''تم بھلا کر ہی کیا سکتے ہو؟ صرف اسکولوں کی برانچیں کھول سکتے ہو لیکن ایک بچی نہیں سنبھال سکتے۔'' علی کا غصّہ عروج پر تھا۔

''میں پچھلے کئی سالوں سے اسکول چلا رہا ہوں آج تک کسی بچے نے ایسا نہیں کیا جو تمہاری بیٹی نے کیا ہے۔'' رضا بولتے ہوئے اُسکے سامنے سے ہٹا، کوئی فائدہ نہیں تھا اِس سے بات کرنے کا۔

''وہ بچی ہے، صرف چار سال کی بچی ہے وہ۔ اُس سے تم اُمید رکھ رہے ہو کہ وہ بڑوں کی طرح ذمے دار ہو؟'' علی نے اُسکے پیچھے سے کہا۔

''اچھا! بس کرو تم دونوں۔۔۔ اور اسکول کے آس پاس کے علاقوں میں دیکھا ہے؟'' مقدّم نے معاملہ ٹھنڈا کرنا چاہا۔

''دیکھ لیا ہے، لوگوں سے پوچھ بھی لیا ہے پر کسی نے اُسے نہیں دیکھا۔ ہم تصاویر دکھا آئے ہیں اور نمبر بھی دے آئے ہیں تاکہ کسی کو ملے تو فوراً اطلاع دے۔'' حسین نے جواب دیا۔

''پتہ نہیں کہاں ہو گی؟'' علی نے بے بسی سے کہتے ہوئے آس پاس نظریں دوڑائیں جیسے وہ یہی کہیں ہو گی اور ابھی اچانک سے سامنے آجائے گی۔

''تم پریشان نہ ہو، مل جائے گی ان شاءاللہ!'' عمر نے آگے بڑھ کر اسے تسلی دینی چاہی۔

''کیسے پریشان نہ ہوں؟ مجھے نہیں پتہ کہاں ہے وہ؟ اور کس کے پاس ہے؟'' وہ ایک بار پھر چیخا، رضا نے اُسے ناگواری سے دیکھا۔

''چھوڑ دو اُسے اسکے حال پر، اِس نے ساری دنیا سے اپنی بیٹی کے گمشدہ ہونے کا بدلہ لینا ہے۔'' رضا نے بیزاری سے عمر کو کہا جو علی کے پاس کھڑا تھا۔ اُسکی بات پر عمر نے لب بھینچے، ابھی وہ کوئی جھگڑا نہیں چاہتا تھا۔

''اس کو خاموش کروالو ورنہ یہی سب سے پہلے مرے گا میرے ہاتھوں۔'' اُس نے کہا عمر سے تھا مگر سنایا جسے تھا، اُس نے طنزیہ ہنسی ہنستے ہوئے رخ پھیر لیا۔

''رضا! تم بھی تو نظر انداز کرو نہ!'' حسین نے اُسے آہستہ سے سمجھانا چاہا۔

''وہی کر رہا ہوں۔'' اُس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ پھر فون نکال کر کسی کو میسیج کرنے لگا۔ اُسے لمحے وہاں ایک جیپ آ رکی۔ سیاہ جینز پر کاہی رنگ کی ٹی شرٹ، جسکا رنگ اتنا گہرا تھا کہ سیاہی کا تاثر دیتا تھا، اور اُس پر سیاہ شرٹ ڈالے، جسکے بٹن آگے سے کھول رکھے تھے، چہرے پر ازلی سختی، ماتھے پر چھائی شکنوں کا جال، اور آنکھوں پر گوگلز لگائے وہ نوید تھا، جو اُس جیپ سے اترا تھا۔

''مجھے اسکول کے قریب رہائشی علاقے کی ویڈیو ملی ہے، وہاں پر نشیبہ کو دیکھا گیا ہے، ٹیم علاقے کی چھان بین کر رہی ہے، جیسے ہی کوئی پیش رفت ہوتی ہے تمہیں بتا دیا جائیگا۔'' اُس نے بنا کسی سلام دعا و تمہید کے بات شروع کی تھی۔

''تو تب تک میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہوں؟'' علی نے تڑخ کر پوچھا۔

''ہاں!'' اُس نے بھی صاف گوئی کی انتہا کر دی تھی۔

''بھاڑ میں جاؤ تم لوگ۔۔۔'' علی کہہ کر جانے کے لیے مڑا۔

''کہاں ڈھونڈو گے اُسے؟ سڑکوں پر؟'' نوید نے پیچھے سے پوچھا تو وہ رکا، پھر مڑ کر اُسے دیکھا۔

''ہم اُسے ڈھونڈ رہے ہیں تمہیں گھر جانا چاہیے۔'' اُسکا سرخ چہرہ اور ویران آنکھیں دیکھ کر وہ تھوڑا نرم پڑا۔

''وہ ٹھیک کہہ رہا ہے، اس طرح کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ تمہیں اندر جانا چاہیے۔'' عمر نے بھی تائید کی۔

''تمہیں سمجھ کیوں نہیں آرہا کہ نشمیہ تین گھنٹوں سے غائب ہے؟ پتہ نہیں۔۔۔ کوئی نقصان نہ پہنچادے اُسے۔'' وہ کہہ نہیں پارہا تھا، بتا نہیں پارہا تھا، سمجھا نہیں پارہا تھا۔ اصل پریشانی یہی تھی کہ اُسکی بیٹی کسی غلط انسان کے ہاتھ نہ لگ جائے۔ اس سے آگے نہ اُس سے سوچا جارہا تھا نہ وہ سوچنا چاہتا تھا۔

''آؤ! تم اندر چلو۔'' عمر نے آگے بڑھ کر اُسے بازوؤں سے پکڑا اور اپنے ساتھ لیکر آگے بڑھنے لگا۔ وہ کسی زندہ لاش کی طرح گھر کے دروازہ کی طرف بڑھنے لگا۔

''لیکن میں۔۔۔ میں اندر کیوں جارہا ہوں؟ میری بیٹی غائب ہے۔'' وہ بڑبڑاتا ہوا رکا تو عمر کو اُسکی ذہنی حالت پر شک گزرا۔

''نہیں! میں نشمیہ کو لیے بنا نہیں جاسکتا۔'' وہ واپس مڑا، اس بار نوید سامنے آگیا۔

''علی! تمہاری بیٹی کو کچھ نہیں ہوگا، میرا وعدہ ہے تم سے۔۔۔ تم پلیز! اندر چلو۔'' نوید کے لہجے میں کچھ تھا کہ وہ رک گیا۔

''بچے ایسی حرکتیں اور شرارتیں کرتے ہیں، ہوسکتا ہے اسکول میں ہی کہیں ہو۔'' اس بار حسین نے بھی سمجھانے کی کوشش کی۔

''بچے ایسا کرتے ہیں، لیکن بڑے اگر نااہل اور غیر ذمّے دار نہ ہوں تو ایسا کبھی نہ ہو۔'' وہ سخت لہجے میں بولتے کس طرف اشارہ کررہا تھا؟ سب بخوبی جانتے تھے۔ جسکی طرف اشارہ تھا اس نے ضبط سے لب بھینچے۔

''نشمیہ مل جائے، سب سے پہلے اس بیکار اسکول سے ہی نکالوں گا اسے۔۔۔'' تیز آواز میں بڑبڑاتا وہ خود تو گھر کے اندر چلا گیا، لیکن باقی سب نے بے ساختہ مڑ کر رضا کو دیکھا تھا۔ تپتے چہرے اور بھینچے ہوئے لبوں کے ساتھ وہ کچھ دیر سڑک کو دیکھتا رہا، پھر اگلے ہی لمحے جھٹکے سے مڑا اور تیزی سے علی کے پیچھے اُسکے گھر کے اندر داخل ہوا۔ وہ لوگ ہکا بکا رہ گئے۔

''رضا رکو!۔۔۔'' نوید کو چھوڑ کر وہ تینوں ہی اُسے آوازیں دیتے رہ گئے، پر وہ بھی ڈھٹائی سے اُسکے پیچھے گیا تھا۔

بہت ہوگیا تھا، اُس نے رضا کی محنت سے بنائے گئے اسکول کو بے کار کہا تھا۔ اب واقعی بہت ہوگیا تھا۔۔۔

''باپ اگر غیر ذمّے دار اور نااہل نہ ہو تو واقعی کسی بھی بیٹی کے ساتھ ایسا نہ ہو۔'' رضا کی چنگھاڑتی آواز پر لان میں سر تھام کر کھڑے علی نے پلٹ کر خونخوار نظروں سے اُسے دیکھا۔ وہ وہیں تھا، باقی چاروں عجلت میں پیچھے داخل ہوئے تھے۔

''میں تمہارے منہ نہیں لگنا چاہتا۔''اُس نے بے زاری سے کہا۔ سفیر صاحب جو اُنکی وہاں موجودگی سے ناواقف تھے،اس شور پر وہ بھی لان میں آ گئے۔

''مجھے بھی ایسا کوئی شوق نہیں ہے، لیکن بہتر یہ ہو گا کہ تم پہلے اپنے گریبان میں جھانکو۔ایک بچی تو سنبھالی نہیں گئی تم سے،اُسکے غائب ہونے میں سب سے بڑا کردار خود تمہارا ہے۔''رضا کے لہجے میں تلخی ہی تلخی تھی۔آج اُسکی بس ہو گئی تھی، یہ آدمی ہر چیز کا ذمّے دار اُسے ہی کیوں ٹھہرا دیتا تھا؟

''کیا بکواس کر رہے ہو؟''وہ اُسکے مد مقابل آ کھڑا ہوا۔ عمر نے آگے بڑھ کر رضا کو آنکھوں ہی آنکھوں میں خاموش رہنے کی درخواست کی۔

''اپنا سچ تمہیں بکواس کیوں لگتا ہے علی؟''اُس نے بڑے اطمینان سے اُسے آگ لگائی تھی۔ سفیر صاحب نے پریشانی سے، مقدّم نے ناگواری سے اور حسین نے بیزاری سے اُن دونوں کو دیکھا تھا۔ جبکہ نوید اس سارے معاملے میں لاتعلق سا، سینے پر ہاتھ باندھے،لان میں بنے ستون سے ٹیک لگائے کھڑا ہو گیا تھا۔ان دونوں کا تو روز کا ہی تھا۔

''بتاؤ کیا نااہلی دکھائی ہے میں نے؟ذرا میں بھی تو سنوں۔''علی کا بھی دماغ گھوما،وہ ہر بار اُسکے ذاتی مسئلے کیوں نکال لاتا تھا؟ حسین نے پاس رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے سر دونوں ہاتھوں میں گرا لیا،وہ انکے روز روز کے جھگڑوں سے واقعی تنگ تھا۔

''تم دونوں کسی وقت تو خاموش ہو جایا کرو۔''مقدّم نے جیسے التجا کرنی چاہی تھی، لیکن دوسری جانب اُن دونوں کو ہی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ نوید فون میں مصروف تھا۔

''تم نے نشمیہ کو خود اسکول چھوڑنے کے بجائے وین لگوائی،اور چلو لگوا بھی دی تو اسکول کی آفیشل وین لگوانے کے بجائے کوئی لوکل وین لگوائی، پہلی نااہلی۔۔۔تمہاری بیٹی رو رہی تھی صبح سے،اسکول میں بھی وہ اُداس تھی، یقیناً وہ گھر سے ہی پریشان آئی تھی۔ تم نے اس حالت میں بھی اُسے اسکول بھیجا یہ تمہاری دوسری نااہلی اور تم سے بڑھ کر نااہل باپ کون ہو گا جس کے موبائل میں اپنی بیٹی کی ایک تصویر تک نہیں ہے؟''موبائل سے سر اٹھا کر نوید نے ناگواری سے دونوں کو دیکھا پھر سر جھٹک کر دوبارہ موبائل میں مصروف ہو گیا۔ان الزامات پر تو علی کا خون کھول اٹھا۔

''وین ڈرائیور پچھلے چھے سال سے میرے بیٹے کو بھی اسکول لیکر جارہا ہے،اور نشمیہ کے گم ہونے میں وین والے کی کوئی غلطی نہیں ہے۔ اپنی غلطیاں دوسروں کے سر مت ڈالو۔''اُس نے اپنا لہجہ بلند ہونے سے روکا تھا۔

''اور بچے تو کسی بھی بات پر ضد لگا کر رونا دھونا شروع کر دیتے ہیں،اسکا مطلب یہ نہیں ہے کہ اُنہیں گھر سے ہی کوئی پریشانی ہو۔''اب کے عمر نے علی کا ساتھ دیتے ہوئے وضاحت دی۔

''جیسے کہ میں جانتا نہیں کہ یہ کتنا ٹاکسک انسان ہے؟ پتہ نہیں وہ بچی کیسے رہ رہی ہے اسکے ساتھ؟''رضا نے غصّے سے کہا۔اصل غصّہ اُسے نشمیہ کے رونے پر تھا،وہ بچوں کو روتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔اور ویسے بھی علی کا رویہ وہ اُسکے بیٹے کے ساتھ دیکھ ہی چکا تھا،لہٰذا بیٹی کے لیے بھی اُسے کوئی اچھے کی اُمید نہیں تھی اُس سے۔

''جسٹ شٹ اپ رضا!۔۔۔''علی کی آواز بلند ہوئی۔

''یو شٹ اپ۔۔۔''رضا نے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

''بس کر دو تم دونوں۔۔۔''پیچھے کھڑا نوید چیخا نہیں تھا،حلق کے بل دھاڑا تھا۔اس دھاڑ پر سب کو لمحے بھر کے لیے سانپ سونگھ گیا تھا۔

''کسی موقع محل کا لحاظ ہی نہیں رہا ہے تم دونوں کو۔''وہ سخت مگر بلند لہجے میں کہتا اُن دونوں قریب آیا،پورے لان میں سنّاٹا چھا چکا تھا۔

''تمہارے اس طرح چیخنے چلانے،یا دوسروں کو الزام دینے سے تمہاری بیٹی نہیں مل جائے گی۔''اُس نے علی کو مخاطب کیا،اور اُسکے جواب دینے سے پہلے ہی برابر کھڑے رضا کی طرف گھوما۔

''اور تم۔۔۔''انگارہ آنکھوں سے رضا کو دیکھا،وہ چپ ہی رہا۔''اگر وہ پریشان ہے اور کچھ بھی بولتا جارہا ہے تو کم از کم تم ہی خاموش ہو جاؤ۔''کوئی اور ہوتا تو رضا،یقیناً اس لہجے میں بات کرنے پر سامنے والے کا منہ توڑ دیتا،پر وہ کچھ روز قبل نوید کو پولیس والے پر تشدد کرتا دیکھ چکا تھا۔سو چپ رہنے میں ہی عافیت جانی۔اور ویسے بھی اس لمحے اُسکا چہرہ خطرناک حد تک سرخ ہو رہا تھا،یقیناً اُسکا پارہ چڑھ چکا تھا۔ اُس نے کچھ لمحے غصّے سے اُن دونوں کو گھورا۔

''مجھے اب تم دونوں کی آواز نہیں آنی چاہیے۔'' دونوں کو تنبیہہ کرتے ہوئے وہ اپنے فون پر آنے والی کال کو سننے کے لیے باہر نکل گیا۔ رضا خاموشی سے پیچھے ہٹ گیا، جبکہ علی لان میں رکھی کرسی پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا۔

''میں بتا نہیں سکتا کہ اِن دونوں کو نوید کی کتنی اشد ضرورت تھی؟'' حسین نے آہستہ سے مقدّم کے کان میں کہا تو اتنی سنجیدہ صورتحال میں بھی وہ اپنی مسکراہٹ چھپا نہیں سکا۔

علی کا دل بھاری ہو رہا تھا، عجیب عجیب سے وسوسے آ رہے تھے۔ خدانخواستہ اُسکے ساتھ کچھ برا ہو گیا تو؟ آج کل جو خبریں آ رہی تھیں، اُس صورتحال میں تو بچوں کو ویسے ہی ہرگز اکیلا نہیں چھوڑا جانا چاہیے، کجا کہ اُس نے وین ہی لگوا دی۔ صحیح تو کہہ رہا تھا رضا، اگر وہ اُسے وین نہ لگواتا تو وہ روتے ہوئے اسکول سے نہ نکلتی۔ اب رہ رہ کر اپنے آپ پر غصّہ آ رہا تھا۔

''علی! میں عمر کے ساتھ جا رہا ہوں، ہم آس پاس کے علاقوں میں دوبارہ دیکھتے ہیں۔'' مقدّم نے اُسکے قریب آ کر کہا۔

''میں بھی ساتھ آؤں؟'' وہ فوراً سیدھا ہوا۔

''نہیں! تمہاری طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے، اُس پر سے اس وقت تمہیں یہاں ہونا چاہیے۔ جیسے ہی کچھ پتہ چلے گا، ہم فوراً بتا دیں گے۔'' اُس نے منع کیا تو علی نے سر ہلا دیا۔ وہ دونوں چلے گئے، تو وہ کچھ دیر وہیں بیٹھا رہا پھر کھڑا ہوا اور حسین کو مخاطب کیا۔

''میں نماز پڑھ کر آتا ہوں۔'' وہ کہہ کر اندر جانے کے لیے مڑا، پھر رکا اور ایک نظر لاتعلق سے کھڑے رضا کو دیکھا اور پھر باآواز بلند بولا۔

''اندر آنا ہے تو آ جاؤ، باہر بہت دھوپ ہے۔'' حسین نے تو باقاعدہ مسکراہٹ ضبط کی تھی، البتہ رضا نے برابر نظرانداز کیا تھا۔ علی دانت کچکچاتے ہوئے اندر چلا گیا۔ نوید نامعلوم کہاں غائب تھا؟ اُسکے اندر جانے کے بعد حسین، رضا کے پاس آیا۔

''تمہیں اندر آنے کی دعوت دی ہے تمہارے دوست نے۔۔۔'' اُس نے شرارت سے کہا تو رضا نے گھوری سے نوازا۔

''تم چلے جاؤ!'' چڑ کر کہتا وہ وہیں سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔

''تمہیں غصّہ آ رہا ہے تو ہم یہاں سے چلے جاتے ہیں۔'' حسین بھی اُسکے برابر آ بیٹھا، یہ فقط دو ہی سیڑھیاں تھیں، جو لان کو گھر سے جوڑتی تھیں۔

''میں کہیں نہیں جارہا۔''اُس نے کہا۔دھوپ تیز تھی،اُسکا چہرہ تپش سے نم آلود ہو رہا تھا۔

''کیوں؟علی کی اتنی فکر؟''وہ باز نہ آیا۔

''علی کی نہیں،اُسکی بیٹی کی۔جب تک وہ مل نہیں جاتی میں یہاں سے کہیں نہیں جارہا۔وہ مل جائے تو میں،اِس سے حساب کتاب پورا کر کے جاؤں گا۔''

''کس سے؟''

''نشمیہ کے باپ سے۔۔۔''رضا نے تپ کر کہا تو وہ مُسکرا دیا۔

''اللہ کرے کہ وہ صحیح سلامت گھر پہنچ جائے۔''حسین نے کہا۔

''آمین!''

--------+---------+----------

ظہر کی نماز ادا کر کے اُس نے دعا کی لیے ہاتھ اٹھائے تو نظریں دیوار پر لگی گھڑی تک گئیں۔سہ پہر کے چار بج چکے تھے۔نشمیہ کو غائب ہوئے پانچ گھنٹے ہو چکے تھے۔ایسا لگ رہا تھا کہ جسم سے روح نکل چکی ہو،پانچ گھنٹوں سے نہ جانے وہ کہاں تھی؟کس کے ہاتھوں میں تھی؟ ٹھیک بھی تھی یا نہیں؟صبح اُس نے ناراضگی میں ناشتہ بھی نہیں کیا تھا صبح سے،یقیناً بھوکی ہو گی۔

''یااللہ!میری بیٹی کو میرے پاس بحفاظت پہنچا دیں۔میرا وعدہ ہے دوبارہ کبھی نہیں ڈانٹوں گا اُسے،کبھی خود سے دور نہیں کروں گا۔ میرے پاس اب کھونے کو کچھ نہیں ہے اللہ!میری بیٹی مجھ سے نہ لیں۔''اُسے یاد بھی نہیں کہ اُس نے کتنے عرصے بعد دعا مانگی تھی؟اور مانگی بھی تو کس کے لیے؟جسے وہ کل تک اپنی بیٹی نہیں مان رہا تھا؟اور آج وہ اُسکی بیٹی ہو گئی تھی۔ کافی دیر دعا مانگ کر بھی جب دل کو تسلی نہ ہوئی تو جائے نماز لپیٹ کر کھڑا ہوا،سنگھار میز پر نشمیہ کی دو پونیاں رکھی نظر آئیں تو دل بھر آیا۔آگے بڑھ کر اُسے اٹھا لیا۔وہ اُسے کیسے بتاتا؟کیسے بتاتا کہ وہ در حقیقت اُسے خود سے دور کرنے سے ڈر گیا تھا۔چند دنوں میں وہ اُسکا اتنا عادی ہو گیا تھا کہ یہ سوچ،کہ وہ کہیں فاطمہ کے دوسرے شوہر کی بیٹی نہ ہو،اُسے ڈرا دیتی تھی۔یہی وجہ تھی کہ وہ اُسے خود سے دور رکھنا چاہتا تھا۔پر آج اُسے نہ کسی ڈی این اے کی

ضرورت تھی، نہ کسی تصدیق کی۔ وہ ایمان لا چکا تھا کہ وہ اُسی کی بیٹی ہے۔ ایسے کسی غیر کے لیے اُسکا دل تڑپ نہیں سکتا تھا۔ ایسا تو بس اولاد کے لیے ہوتا ہے۔ احمد گیا تھا تو پھر بھی دل کے کسی کونے کو یہ اطمینان تھا کہ وہ اپنی ماں کے ساتھ ہے۔ پر نشمیہ تو ایسا لگ رہا تھا جیسے دنیا میں ہی کہیں نہ تھی۔

جائے نماز رکھ کر وہ باہر آیا تو سر بھاری ہو رہا تھا، طبیعت عجیب سی ہو رہی تھی، لگ رہا تھا جیسے زیادہ دیر اپنے پیروں پر کھڑا نہیں رہ سکے گا۔ نوید بار بار کسی سے کال پر بات کرتا، ہر بار علی اُمید سے اُسے دیکھتا کہ شاید کوئی اطلاع ہو پر وہاں سے کوئی جواب نہ آتا، سفیر صاحب کی الگ حالت خراب تھی۔ عمر اور مقدّم اسکول کے آس پاس کے تمام علاقوں میں لوگوں سے نشمیہ کے متعلق پوچھ رہے تھے، پر اُنکی جانب سے بھی کوئی خبر نہ آئی تھی۔

اسی اثنا میں ڈھائی گھنٹے مزید گزر گئے، عمر اور مقدّم واپس نہ آئے، نہ نشمیہ کی کوئی خبر آئی۔ علی کی طبیعت بد سے بدتر ہو گئی۔ اس دوران وہ کئی مرتبہ رضا سے اُلجھ چکا تھا، البتہ اب اُسکی طبیعت کے پیش نظر رضا اُسے نظر انداز کر رہا تھا۔

''تم ٹھیک نہیں لگ رہے مجھے۔'' حسین نے اُسکے پاس آتے ہوئے کہا۔

''میں ٹھیک ہو بھی نہیں سکتا۔'' اُس نے آہستہ آواز میں کہا تو حسین کو اُس پر ترس آیا۔ اُسی وقت علی کو اپنی ناک کے پاس کسی گیلی چیز کا احساس ہوا، اُس نے فوراً ہاتھ رکھا اور پھر ہتھیلی کو نظروں کے سامنے کیا تو حیران رہ گیا۔ اُسکی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ جھٹکے سے اٹھتا باتھ رُوم کی طرف گیا تھا۔

''علی!۔۔'' حسین نے پریشانی سے پیچھے سے پکارا تھا۔ رضا اور نوید نے علی کو تیزی سے اٹھ کر جاتا دیکھا تو ناسمجھی سے حسین کے پاس آئے۔

''کیا ہوا اسے؟'' رضا نے پوچھا۔

''نوز بلینڈنگ (ناک سے خون) ہوئی ہے۔'' کچھ ہی دیر میں وہ چہرہ دھو کر باہر آ چکا تھا۔

''تم اپنا بی پی چیک کرو۔'' حصے نے کہتے ہوئے پاس رکھی بلڈ پریشر کی مشین اٹھائی اور علی کے نہ نہ کرنے کے باوجود بھی اُسکے بازو پر لگادی۔ مشین نے جو اعداد و شمار دکھائے اُسے دیکھ کر تو اُنکے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ مشین کے مطابق اُس کا فشار خون اس وقت خطرناک حد تک بڑھا ہوا تھا۔

علی نے بازو پر بندھی مشین اُتاری اور اٹھا کر فرش پر دے ماری۔ یہ اُسکے اندر ابلتے غصّے کی انتہا تھی۔ پھر تھک کر سر ہاتھوں میں گرالیا۔ وہ تینوں اُسکی حالت سمجھ رہے تھے لہٰذا کچھ بھی نہ بولے۔

مساجد سے مغرب کی اذانیں سنائی دینے لگیں پر نشمیہ کی کوئی خبر نہ آئی۔ پورا علاقہ اس وقت تلی ہوئی اشیاء کی خوشبوں سے مہک رہا تھا۔ لوگ پہلی افطاری جوش و خروش سے کر رہے تھے۔ سفیر صاحب کھجوریں اور شربت لے آئے کہ کم از کم وہ لوگ روزہ تو کھول لیں۔ دل نہ چاہتے ہوئے بھی علی نے ایک کھجور سے روزہ افطار کر لیا تھا۔ باقی تینوں نے بھی یہی کیا تھا۔ روزہ کھولتے بھی علی کے دل میں بس نشمیہ کی صحیح سلامت واپسی کی دعائیں تھیں۔ اُسی لمحے رضا کے موبائل پر کسی کی کال آئی تو وہ اُسے سننے باہر چلا گیا، وہ کافی دیر باہر رہا، نہ جانے کیا بات تھی؟ تقریباً بھی بیس سے پچیس منٹ بعد جب وہ واپس آیا تو اُسکے ساتھ نہ صرف مقدّم اور عمر تھے، بلکہ عمر کی گود میں سہمی ہوئی سی نشمیہ بھی تھی۔

''نشمیہ!'' اُسے دیکھ کر علی کے منہ سے بے یقینی سے اُسکا نام ادا ہوا۔ عمر نے اُسے گود سے اتارا۔

''نشمیہ!'' وہ دیوانہ وار اُسکی جانب بڑھا تھا۔

''یہ کہاں ملی؟'' نوید نے مقدّم سے پوچھا تھا۔ اس سے پہلے وہ کوئی جواب دیتا، علی کی دھاڑ نے اُنہیں اپنی جانب متوجہ کیا تھا۔

''کہاں گئی تھی تم؟ کس سے پوچھ کر اسکول سے نکلی تھی؟ ہاں؟'' وہ گھٹنوں کے بل اُسکے سامنے بیٹھا، اُسے بازو سے پکڑ کر پوچھ رہا تھا۔ وہ پہلے ہی ڈری ہوئی تھی، مزید خوفزدہ ہو گئی۔ علی کو مطلق پرواہ نہ تھی۔

''کوئی لے جاتا تمہیں تو؟'' اُس نے اُسے جھنجھوڑ ہی دیا تو وہ رونے لگ گئی۔ رضا نے ناگواری سے دیکھتے ہوئے نشمیہ کو اس سے دور کیا۔

''بس کر دو علی! وہ بچی ہے۔'' عمر نے بھی کہا اور پھر نشمیہ کو سفیر صاحب کے حوالے کر دیا۔ علی اب کہ چپ ہی رہا، البتہ اُسکا تنفس پھولا ہوا تھا۔ دن بھر کا غصّہ اور پریشانی نشمیہ پر ہی نکال دی تھی اُس نے۔ سفیر صاحب نشمیہ کو وہاں سے لے گئے۔

''کہاں تھی یہ؟''علی نے کھڑے ہوتے ہوئے مقدم سے پوچھا۔

''مجھے رضا نے فون کر کے کہا کہ یہ اسکول میں ہے اور میں لے آؤں۔''مقدّم نے کہا تو علی سمیت باقی دونوں نے بھی بے یقینی سے اُسے دیکھا۔

''پوری بات بتاؤ!''رضا نے کھا جانے والی نظروں سے مقدّم کو دیکھا تو وہ گڑبڑایا۔

''ہاں! میں پوری بات بتا ہی رہا تھا۔''اُس نے سر کھجاتے ہوئے کہا، آج کا روزہ کچھ زیادہ ہی لگ رہا تھا۔

''دراصل! ایک بوڑھی خاتون کو نشمیہ ملی تھی، وہ اُسے گھر لے گئیں۔ پھر اُنہوں نے اپنی سی بہت کوشش کی کہ اس سے اُسکے گھر کا کوئی ایڈریس یا نمبر معلوم کر لیں، پر اُسے کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ پھر خاتون خود بوڑھی تھی، اس لیے اپنے بیٹے کے آنے کا انتظار کرنے لگیں۔ بیٹا گھر آیا تو اس نے نشمیہ کا یونیفارم دیکھ کر اسکول پہچان لیا، وہ پہلے نشمیہ کو قریبی برانچ لے گیا، وہاں اُسے اس برانچ کا معلوم ہوا، جہاں یہ پڑھتی ہے تو پھر اُسے وہیں لے آیا۔ اس وجہ سے دیر ہو گئی ورنہ یہ پہلے ہی مل جاتی۔''مقدّم نے تفصیلاً بتایا۔

''تو تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ اسکول میں ہے؟''نوید نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''رضا نے بتایا۔''اُس نے ایک بار پھر مکمل بات نہیں کی، اب کہ رضا نے خون خوار نظروں سے اُسے گھورا اور بولا۔

''اسکول کی انتظامیہ نے مجھے کال کر کے اُسکے مل جانے کی اطلاع دی تھی، مقدّم اسکول کے قریب ہی تھا تو میں نے اسے ہی کال کی تاکہ یہ نشمیہ کو لے آئے۔''اُس نے چبا چبا کر کہا تھا۔ مقدّم بس سر جھکا کر رہ گیا۔ وہ واقعی تھک گیا تھا، یا اُسے سچ میں روزہ لگ رہا تھا، جو آدھی ادھوری بات کر رہا تھا۔

''اللہ کا شکر ہے کہ وہ صحیح سلامت گھر پہنچ گئی ہے۔''حسین نے کہا۔

''ہاں! لیکن گھر سے دور رہ کر وہ ڈر گئی ہے کافی۔''عمر نے بتایا۔

''خیر! اب تمہیں آرام کرنا چاہیے۔''نوید کو جانے کی جلدی تھی۔ اُسکے کچھ بھی کہنے سے پہلے ایک بار پھر علی کی ناک سے خون آیا تھا۔ وہ بیزار سا منہ بنا کر باتھ رُوم کی طرف بڑھا تھا۔

''اسے کیا ہوا؟''عمر پریشان ہوا۔

''بی پی ہائی ہے کافی۔''حسین نے بتایا۔

''اسے ہسپتال جانا چاہیے،اُسکی حالت ٹھیک نہیں لگتی۔''مقدّم کو بھی تشویش ہوئی۔

''وہ تو راضی ہو جائیگا جیسے۔۔۔''حسین نے منہ بنایا۔

''ٹھیک ہے! تم لوگ اسے راضی کرو۔میں باہر ہوں۔''نوید حکم صادر کرتے ہوئے،اُنہیں ہکا بکا چھوڑ کر باہر چلا گیا۔ویسے بھی وہ بہت کم بات کرتا تھا اور کرتا تھا تو بہت مختصر۔

''کیا مطلب کہ ہم راضی کریں؟''حسین حیران ہوا۔خیر نہ معلوم کیسے پر علی ہسپتال جانے پر راضی ہو ہی گیا۔عمر اور نوید اُسے ایمر جنسی میں لے آئے تھے۔جہاں پہلے تو اُسکا فشار خون اس قدر بلند ہونے پر ڈاکٹر نے اُسے ٹھیک ٹھاک جھاڑ پلائی تھی،پھر اُسے ڈرپ میں دو چار انجکشن دے کر چلا گیا تھا۔اب ہسپتال کے بستر پر ٹیک لگائے بیٹھا علی،خاموشی سے اپنے ہاتھ میں لگے کینولا کو دیکھ رہا تھا۔

''تمہیں لیٹ جانا چاہیے۔''عمر نے اُسے مسلسل بیٹھا دیکھ کر کہا۔

''میں ٹھیک ہوں،یہ ڈرپ ختم ہو تو فوراً گھر جاؤں گا۔''اُس نے مختصراً کہا۔

''ٹھیک ہے! جیسے تمہیں صحیح لگے،میں بھی اب چلتا ہوں۔تم اپنا خیال رکھنا۔''اُس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''خدا حافظ!''اُسکی طبیعت اس قدر خراب تھی کہ وہ چاہتے ہوئے بھی عمر کا شکریہ نہیں ادا کر سکا۔

''خدا حافظ!''عمر باہر آ گیا۔جبکہ نوید اُسکے پاس ہی بیٹھا رہا۔وہ باہر آیا تو رضا،مقدّم اور حسین کو راہداری میں کھڑا دیکھ کر حیران ہوا۔

''تم لوگ گئے نہیں؟''اس نے پوچھا۔وہ سمجھا تھا کہ وہ لوگ جا چکے ہوں گے،کیونکہ علی کے گھر سے نکلتے ہوئے یہی طے ہوا تھا کہ صرف نوید اور عمر اُسکے ساتھ ہسپتال جائیں گے۔پر اب وہ تینوں بھی یہاں کھڑے تھے۔

''طبیعت کیسی ہے اُسکی؟''رضا نے سنجیدگی سے عمر سے پوچھا۔ظاہر نہیں کر رہا تھا،پر علی کی فکر ہو رہی تھی اُسے۔

''خود پوچھ لو جا کر۔''جواب مقدّم کی طرف سے آیا تھا۔

''میرے منہ کی بات چھین لی۔''حسین ہنسا تو رضا نے سنجیدگی سے دونوں کو دیکھا۔

''اخلاقیات بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔''بتانا ضروری سمجھا کہ بس مروت کے طور پر علی کی طبیعت پوچھی ہے، ورنہ اُسے کوئی فکر نہ تھی اُسکی۔

''تم ذرا غصّہ کم کیا کرو۔''یہ غیر متوقع ہدایت بھی مقدّم کی طرف سے آئی تھی۔اب کہ حسین دل کھول کر ہنسا۔رضا نے فقط گھورنے پر اکتفا کیا۔

''چلو! میں نکلتا ہوں۔اب اگر گھر پہنچ کر مکمل افطار نہ کی تو راستے میں ہی شہید نہ ہو جاؤں۔''حسین نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔اور کچھ ہی دیر میں وہ چاروں وہاں سے جا چکے تھے۔

نوید اپنی مرضی سے علی کے ساتھ رکا تھا، وہی ڈرپ ختم ہونے کے بعد اُسے گھر لے جانے والا تھا۔

---------+---------+--------

پرانے آرٹسٹک فرنیچر سے سجا کمرہ اس وقت نیم اندھیرے میں تھا۔دائیں طرف کی دیوار مختلف قسم کے اسلحوں سے مزین تھی۔کمرے کی دوسری جانب کھڑکی کے پردے گرے ہوئے تھے، کھڑکی سے منسلک میز پر کچھ پرانے کاغذ اور ایک لال کور والی ڈائری کھلی پڑی تھی۔ کرسی پر بیٹھا وجود، ڈائری پر جھکا، کمرے کے نیم اندھیرے میں گم ہو رہا تھا۔میز پر جلتی اسٹڈی بلب کی ہلکی پیلی روشنی میں اُسکا وجود فقط سائے کی مانند نظر آتا تھا۔سارے کمرے میں روشنی فقط اُسی جگہ تھی، جہاں وہ بلب روشن تھا۔اُس نے ہاتھ بڑھا کر قلم اٹھایا اور ڈائری کے صفحے پر کچھ لکھنے لگا۔پیلی روشنی میں اُسکا لکھا گیا جملہ نیم واضع سا ہوا۔

''میں ڈائری نہیں لکھتا۔پر جو میں نے کیا، اُس نے مجھے لکھنے پر مجبور کر دیا۔وہ چھے تصاویر، وہ چھے لڑکے۔۔ وہ جو کبھی دوست تھے، جنہیں میں نے یہیں بیٹھ کر، آخری صفحے پر جمع کیا تھا۔

وہ آخری صفحہ جس نے سی ٹی ڈی والوں کے وجود میں سنسنی دوڑادی ہے۔جب ہی تو سب کے سب کو اکھٹا کر لیا۔سب کے سب۔۔۔نہ ایک کم نہ ایک زیادہ۔۔"سایہ ہوتا وجود مسکرایا،اُسکی مسکراہٹ دلفریب تھی۔وہ قلم کی مدد سے صفحے پر الفاظ بکھیر رہا تھا،اور الفاظ صفحوں پر صفحے بھرتے جارہے تھے۔بلآخر وہ سیدھا ہو بیٹھا۔اُسکی داستان پوری ہو چکی تھی۔اندھیرے کمرے کی ہلکی پیلی روشنی کے نیچے لکھے گئے، اُسکے گڈ مڈ ہوتے نیم واضع الفاظ میں صرف ایک جملہ نظر آرہا تھا۔

"مجھ تک کوئی نہیں پہنچ سکے گا۔"

اب وہ نیچے اپنا نام لکھ رہا تھا۔اور شوقیہ دستخط۔

بس ایک شوقیہ دستخط۔۔۔

وہ چھے تصاویر۔۔۔

ایک ڈائری۔۔۔

اُسکا آخری صفحہ۔۔۔

سایہ ہوتا وجود۔۔۔

اُسکی دلفریب مسکراہٹ۔۔۔

اور

مورخہ چھے۔۔۔

گھر میں خاموشی کا راج تھا،سفیر صاحب یقیناً نشمیہ کو سلا چکے تھے۔علی کو نوید کے ساتھ گھر واپس آتا دیکھ کر وہ بھی مطمئن ہو گئے،اُسکی طبیعت اب کافی سنبھل چکی تھی۔وہ خاموش پڑے لاؤنج کے صوفے پر بیٹھ گیا۔ہاتھ کی پشت پر سنی پلاسٹ بندھی ہوئی تھی۔

''تم نے بس کھجور سے روزہ کھولا تھا، کچھ کھاؤ گے ؟'' سفیر صاحب نے پوچھا۔

''ہسپتال میں کھالیا تھا۔'' اُس نے مختصر جواب دیا۔ پھر چہرہ اٹھا کر اُنہیں دیکھا۔ نشمیہ کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا پر پوچھ نہیں سکا۔

''آپ سو جائیں، تھک گئے ہوں گے۔'' اُس نے نرمی سے کہا تو وہ کچھ حیران ہوئے۔ پھر اثبات میں سر ہلاتے کھڑے ہوئے۔

''تمہارا شکریہ بیٹا! تم نے اتنا خیال رکھا علی کا۔'' اُنہوں نے کافی دیر سے خاموش بیٹھے نوید سے کہا۔

''شرمندہ نہ کریں۔'' اُس نے بے تاثر چہرے کے ساتھ بس اتنا ہی کہا۔ دس سال پہلے اگر اُنہوں نے یہ بات کہی ہوتی تو اُسکا جواب یقیناً مختلف ہوتا۔ ''نہیں انکل! یہ تو میرا فرض تھا'' یا ''علی تو میرا بھائی ہے۔'' جیسا کوئی جملہ۔۔۔ پر اب ایسا نہیں تھا۔ علی اُداسی سے مسکرا دیا، سفیر صاحب چلے گئے۔

''تمہاری ڈی این اے رپورٹ آگئی ؟'' اُنکے جانے کے بعد نوید نے پوچھا تھا۔ یہ وہ سوال تھا جو وہ کب سے کرنا چاہ رہا تھا۔

''نہیں!'' اُس نے فقط یہی کہا۔

''تو پھر۔۔۔'' اُس نے دانستہ بات ادھوری چھوڑی۔

''میں بنا رپورٹ دیکھے بھی جانتا ہوں کہ وہ میری بیٹی ہے۔ میری سگی بیٹی۔۔۔'' اُس نے آہستہ سے کہا۔

''کیسے ؟''

''اگر وہ میری اولاد نہ ہوتی تو میں کبھی بھی اُسکے لیے اتنا پریشان نہ ہوتا۔ میرا دل ہی بند ہونے لگا تھا یہ سوچ کر کہ نا جانے کہاں ہو گی ؟ صرف ایک ہفتے پہلے آئی بچی کے لیے میرے یہ جذبات نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ یقیناً میری ہی بیٹی ہے۔ یہ گواہی میرے دل کی ہے۔'' اُس نے بلآخر تسلیم کر لیا تھا ، نوید کے پاس کوئی جواب نہیں بچا۔

''چلو! یہ تو اچھی بات ہے لیکن۔۔۔'' سنجیدگی سے کہتے وہ رکا۔ ایک تو اُسکا انداز ہمیشہ ایک سا رہتا تھا۔ وہی سنجیدہ اور لاتعلق سا۔ چہرے سے اندازہ لگانا مشکل ہوتا تھا کہ وہ کیا کہنے والا ہے۔ سوائے غصّے یا سنجیدگی کے اُسکے چہرے پر کوئی تاثر ہی نہ ہوتا تھا۔

''لیکن ؟'' علی نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

''تم رضا کے ساتھ ہر بار زیادتی کرتے ہو۔ان سب میں اُسکا سرے سے کوئی قصور نہیں تھا۔مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی اسکول انتظامیہ سے ٹھیک ٹھاک حساب لے گا۔پھر وہ تمہارے ساتھ سارا دن رہا، نشمیہ کی تلاش میں ہر ممکن مدد کی۔ تمہیں اُسکے ساتھ ایسا رویہ نہیں رکھنا چاہیے تھا۔''وہ معتدل لہجے میں سمجھا رہا تھا۔علی شرمندہ ہوا۔

''ہاں! لیکن وہ مجھ سے حساب برابر کر ہی لیتا ہے۔''اُسکا انداز وضاحتی تھا۔

''شروع بھی ہر بار تم ہی کرتے ہو۔''وہ صاف گو تھا۔

''میں پریشان تھا۔لیکن مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔میں معذرت کرلوں گا اُس سے۔۔۔''اُس نے ہار مان لی۔

''معذرت کرنے کی ضرورت نہیں ہے علی! تم اپنے جذبات پر قابو رکھنا سیکھو، غصّے کے دوران اپنی زبان پر قابو رکھنا سیکھو کیونکہ۔۔۔''
وہ رکا تو اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''کیونکہ جو کچھ تم غصّے میں کہہ دیتے ہو، بعد میں معذرت کرنے سے اُسکا اثر زائل نہیں ہوتا علی!''سنجیدگی سے کہتا وہ جانے کے لیے کھڑا ہوا۔علی جہاں تھا، وہیں بیٹھا رہ گیا۔

''اپنا خیال رکھنا، خدا حافظ!''اُسکا جواب سننے کے لیے رکے بنا ہی وہ وہاں سے چلا گیا۔علی ہل بھی نہ سکا۔اُس نے کیسے سمجھ لیا کہ سب کچھ اتنی آسانی سے ٹھیک ہو جائے گا؟اپنے الفاظ کہہ کر وہ خود تو بھول جاتا تھا، پر کیا سامنے والے کے لیے بھی بھولنا اتنا آسان تھا؟آج جو کچھ ہوا وہ بھی تو اُسکی زبان کا ہی نتیجہ تھا۔اگر وہ نشمیہ سے وہ سب نہ کہتا تو وہ اتنا شدید ردعمل نہ دیتی، اگر وہ احمد کے ساتھ نرمی کا رویہ رکھتا تو وہ کبھی اس سے دور نہ جاتا۔آج اُسکے پرانے دوست، اُسکے لیے یہاں آئے، زبانی نہ صحیح پر دوستی کا حق ادا کر گئے، اتنے عرصے اُس سے کوئی تعلق نہ رکھ کر بھی آج تمام تعلق نبھا گئے اور وہ؟اُس نے کیا کیا؟کسی ایک کو بھی ڈھنگ سے شکریہ ادا نہیں کیا۔ایک شکریہ ہی تو کہنا تھا۔آخر وہ اتنا بدزبان اور بدمزاج کیوں ہو گیا تھا؟تمام جمع تفریق کے بعد غلط وہ ہی نکلا۔آج پہلی بار اپنا آپ بہت چھوٹا لگا تھا۔

وہ خاموشی سے اٹھا اور خود کو گھسیٹتے ہوئے کمرے تک آیا۔نشمیہ سو رہی تھی۔سارا دن کی پریشانی کے بعد بھی بچے کتنے سکون سے سو جاتے ہیں؟وہ اُسکے برابر آ بیٹھا۔اُس کا چہرہ غور سے دیکھا۔نین نقش بلکل فاطمہ جیسے تھے، پر آنکھیں اور مزاج بلکل علی کا۔وہ مسکرایا۔
سارا دن اسکو ستا کر خود کتنے آرام سے سو جاتی تھی یہ؟دل کیا اُسے پیار کرے، پر کر نہیں سکا۔نہ جانے کیوں وہ بہت سے کام چاہ کر بھی نہیں

کر پاتا تھا؟ جیسے کوئی شے آڑے آجاتی تھی درمیان میں۔ تھک کر وہ اُسکے برابر ہی لیٹ گیا، اُسکے موبائل پر کوئی نوٹیفکیشن بجا تھا۔ اُس نے دھیان نہیں دیا۔ سحری کا الارم سیٹ تھا، اُسے اٹھنا بھی تھا، لہٰذا جلدی سونا چاہتا تھا۔ دواؤں کا اثر تھا کہ وہ جلد ہی غنودگی میں چلا گیا۔

سائیڈ ٹیبل پر رکھے اُسکے موبائل کی سکرین روشن ہوئی تھی، وہ گہری نیند میں تھا ورنہ دیکھ لیتا کہ۔۔۔

موبائل سکرین، اُسکی میل پر ڈی این اے کی رپورٹ آنے کی اطلاع دے رہی تھی۔

---------+---------+--------

وہ عمارت کی بیسمنٹ میں کھڑا اپنی گاڑی بند کر رہا تھا۔ سفید رنگ کی روشنی میں نہائے بیسمنٹ میں اور بھی مختلف گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اس عمارت میں اُسکا ذاتی فلیٹ تھا، جسے وہ کم ہی استعمال کرتا تھا۔ آج بھی کافی عرصے بعد وہ یہاں آیا تھا۔ کچھ دیر اکیلا رہنا چاہتا تھا۔ پر شاید قسمت کو منظور نہ تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ لفٹ کی طرف بڑھتا، بیسمنٹ کے سنّاٹوں کو چیرتی ایک سفید گاڑی وہاں آرکی۔ اندر بیٹھے وجود کو دیکھ کر وہ حیران کم اور بیزار زیادہ ہوا تھا۔

''تم میرا پیچھا کر رہے ہو؟'' حسین گاڑی سے اترا تو رضا نے ماتھے پر بل ڈالے اُسے دیکھا۔

''تمہارا پیچھے کرنے میں جو مزا ہے وہ کسی حسینہ کا پیچھے کرنے میں بھی نہیں آتا۔'' اُس نے گاڑی کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ رضا نے اُسے سنجیدگی سے گھورا۔

''یہاں کیا کرنے آئے ہو؟'' حسین بھی ڈھیٹ تھا، الٹا اُسی سے سوال کیا۔

''تمہارے لیے رشتہ دیکھنے۔۔۔'' بیزاری سے کہتے وہ لفٹ کی طرف بڑھا۔

''ارے واہ! پھر تو تمہیں، مجھے ساتھ لیکر جانا چاہیے۔'' وہ جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اُسکے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

''میں تمہیں جہنّم میں بھی ساتھ لیکر نہ جاؤں۔'' اُسکی بیزاری میں کوئی فرق نہ آیا۔

''ہاں! وہاں تمہیں اکیلا چھوڑنے پر میں راضی ہوں۔'' سنسان بیسمنٹ میں بیزار سے رضا کے پیچھے پیچھے چلتا حسین، بڑی فرصت سے اُسے جواب دے رہا تھا۔ آگے آگے چلتا رضا لفٹ کے پاس آرکا اور مڑ کر اُسے دیکھا۔

''میں اکیلا رہنا چاہتا ہوں۔''اُسے جتایا کہ تمہاری ضرورت نہیں ہے۔

''تو رہو! میں نے کونسا تمہیں شادی کی آفر کی ہے۔''اُسے رتی بھر فرق نہ پڑا۔ بلکہ لفٹ کے کھلتے ہی وہ پہلے اندر گھس گیا، رضا بھی سر جھٹکتے اندر داخل ہوا، پھر مطلوبہ فلور کا نمبر ڈال کر، دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا ہو گیا۔

''تو تم نے بتایا نہیں۔۔۔''بند لفٹ میں حسین کی آواز گونجی، وہ بھی اُسکے برابر ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ لفٹ کے دروازے پر دونوں کا عکس جھلملا رہا تھا۔

''کیا نہیں بتایا؟''وہ سمجھا نہیں۔

''یہی کہ کس کے لیے رشتہ لے جا رہے ہو میرا؟''

''حسین!''رضا یکدم ہی سیدھا ہوا۔

''کیا ہوا؟''اُس نے بھنویں اچکا کر پوچھا۔

''یہاں میرا ذاتی فلیٹ ہے، اور میں یہاں تب ہی آتا ہوں جب مجھے تنہائی چاہیے ہوتی ہے۔''اُس نے بتایا کم جتایا زیادہ۔

''تو؟''مجال ہے جو سامنے والے کو کوئی شرمندگی ہوئی ہو۔ لفٹ مطلوبہ فلور پر رک گئی۔

''تو یہ کہ تم میری تنہائی میں مخل ہو رہے ہو۔''چبا چبا کر کہتا وہ لفٹ سے باہر نکلا۔ سینے پر ہاتھ باندھے کھڑا حسین بھی سیدھا ہوا اور اُسکے پیچھے چل دیا۔

''مجھے مخل ہونا پسند ہے۔''ایک بار پھر وہ اُسکے پیچھے پیچھے چل رہا تھا، بے پر کی ہانک رہا تھا۔

''اپنی پسند بدلو۔''راہداری میں رضا کی آواز گونجی۔ مختلف اپارٹمنٹ کے دروازے پیچھے رہتے جا رہے تھے۔

''میں کسی کے لیے بھی اپنی پسند نہیں بدلتا۔''

''مجھے اکیلا چھوڑ دو حسین!''اُس نے مڑے بنا ہی التجا کی۔

''کیوں چھوڑ دوں؟انسان اکیلا رہنے دنیا میں تھوڑی آیا ہے؟''

''میں آیا ہوں۔۔۔میں اکیلا ہی آیا تھا اور اکیلا ہی چلا جاؤں گا۔'' وہ چڑا۔

''ہاں! ہم تو مجمع لیکر آئے تھے اور بارات ساتھ لیکر جائیں گے۔'' اُسکی بکواس پر رضا رکا، اُسے خفگی سے دیکھا۔ پھر اگلے ہی لمحے دونوں ہنس دیئے۔

''تم کب بڑے ہو گے؟'' حسین نے پوچھا۔

''حالانکہ یہ سوال تم سے پوچھا جانا چاہیے۔'' اُس نے مسکراتے ہوئے کہا اور اپنے فلیٹ کے دروازے کا لاک کھولنے لگا۔ آج ایک بار پھر حسین اُسکا زبردستی مہمان ہونے والا تھا۔

رضا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا، دروازے کے پاس ہی بنے سوئچ بورڈ پر ہاتھ مار کر لائٹ جلائی پھر مڑ کر راہداری میں کھڑے حسین کو دیکھا۔

''تمہیں اندر آنے کے لیے دعوت نامہ دوں؟'' اُسے وہیں جمے دیکھ کر تپا۔

''نہیں! اجازت نامہ دو۔''

''تم جیسے بڑے اصول پسند ہو ناں؟'' وہ دروازہ کھلا چھوڑ کر اندر بڑھ گیا۔ اندر آ کر مزید لائٹیں جلائیں، کوٹ اُتار کر صوفے پر پھینکا اور کچن میں چلا آیا۔ مڑ کر دیکھنے کی زحمت نہ کی کہ حسین اندر آیا بھی ہے یا نہیں؟ فریج سے پانی نکال کر گلاس میں ڈالا، پھر کھڑے کھڑے کافی میکر آن کیا اور دو پیالی کافی جتنا پانی ڈالا۔ یکدم ہی اُسے احساس ہوا کہ حسین کی آواز نہیں آ رہی۔

''یہ اندر آیا بھی ہے کہ نہیں؟'' وہ مشکوک ہوتا کچن سے باہر نکلا، اپارٹمنٹ خالی نظر آیا تو اُسے پریشانی ہوئی۔ تیزی سے دروازے کی جانب بڑھا، وہ بند تھا۔ اگر حسین نے کیا تھا تو اُسے آواز کیوں نہ آئی؟ اور اگر وہ اندر آ گیا تھا تو کہیں نظر کیوں نہیں آ رہا؟

''یہ واپس تو نہیں چلا گیا؟'' اس خیال کے آتے ہی تیزی سے دروازہ کھول کر باہر جھانکا، راہداری سنسان پڑی تھی۔

''یہ واپس چلا گیا؟'' وہ بھونچکا رہ گیا۔اُسے اُمید نہیں تھی کہ وہ برا مان جائے گا۔خود پر غصّہ بھی آیا اور شرمندگی بھی ہوئی۔افسوس کے ساتھ دروازہ بند کیا اور صوفے کے پاس آکر اپنا کوٹ اٹھا کر جیب سے فون نکالا۔پھر فون بک سے حسین کا نمبر نکالا تا کہ اُسے فون کر سکے۔

''مجھے کیوں فون کر رہے ہو؟'' وہ اچھل پڑا، موبائل ہاتھ سے چھوٹ کر صوفے پر گرا اور دایاں ہاتھ سیدھا دل پر آرکا۔حسین اُسکے پیچھے دانت نکالے کھڑا تھا۔

''لاحول ولا قوۃ۔۔'' اُس نے سانس بحال کرتے ہوئے اُسے گھورا۔دل باقاعدہ حلق میں آگیا تھا۔

''حد ہے! کہاں تھے اتنی دیر سے؟'' اُسے گھورتا ہوا واپس کچن کی جانب چلا آیا۔

''میں تو تمہارے اپارٹمنٹ کا جائزہ لیتے لیتے ٹیرس پر چلا گیا تھا۔اچھی سیٹنگ کر رکھی ہے تم نے۔'' وہ کاؤنٹر کے سامنے رکھی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔اپارٹمنٹ واقعی خوبصورت تھا۔ جواباً رضا خاموشی سے پیالیوں میں کافی پھینٹنے لگا۔ بہت دیر خاموشی چھائی رہی۔اتنی کہ رضا کو سر اٹھا کر دیکھنا پڑا۔وہ اُسے ہی جانچتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''اب تمہیں کیا ہو گیا؟'' وہ کافی کی پیالیاں کاؤنٹر پر رکھ کر اُسکے ساتھ والی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

''تم نے کیوں کیا تھا ایسا؟'' اُسکا سوال وہی تھا، جس سے وہ نظریں چرا رہا تھا۔

''کیا کیا میں نے؟'' انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

''وجہ علی نہیں تھا رضا!'' حسین نے یکدم ہی سنجیدگی سے کہا تھا۔

''وجہ صرف علی ہی تھا۔'' اُس نے زور دیتے ہوئے کہا۔

''نہیں! میں نہیں مانتا۔تم نے اس روز جو بھی کیا تھا، اُسکی وجہ علی نہیں تھا۔تم نے کچھ چھپایا تھا ہم سے۔'' وہ ماننے کو تیار نہ تھا۔

''تم کیا کہنا چاہتے ہو کہ وہ جھگڑا میری وجہ سے ہوا تھا؟'' اُسکے ماتھے پر بل پڑے۔

''نہیں! لیکن اُس جھگڑے کو ہوا تم نے دی تھی۔'' اُس نے صاف گوئی سے کام لیا۔

''تو تم دس سال پہلے کا حساب مانگنے آئے ہو مجھ سے؟'' وہ تلخ ہوا۔

''نہیں! میں صرف جاننا چاہتا ہوں کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ وجہ جاننا چاہتا ہوں میں بس!''

''کوئی وجہ نہیں تھی سوائے اس کے کہ مجھے غصّہ آ گیا تھا۔'' اُس نے وضاحت دینا چاہی۔

''تم نے جو الزامات علی پر لگائے تھے وہ بے وجہ نہیں تھے اور نہ غصّے کی وجہ سے تھے۔ تم نے اس روز جو کیا پورے ہوش و حواس میں جانتے بوجھتے کیا۔''

''اگر تمہیں اسی بارے میں بات کرنی ہے تو تم جا سکتے ہو۔'' اُس نے بے مروتی سے کہا تھا۔

''میں یہاں آیا اپنی مرضی سے ہوں تو جاؤں گا بھی اپنی مرضی سے ہی۔'' اُسکی ڈھٹائی کو داد دینے کا دل کیا۔

''آخر تم چاہتے کیا ہو؟'' رضا نے تھک کر پوچھا تو جواباً وہ خاموش رہا۔ خاموشی کا وقفہ طویل ہو گیا تو رضا کو اپنی بدلحاظی کا احساس ہوا۔

''میں۔۔۔ میں بس۔۔۔ بات نہیں کرنا چاہتا اس موضوع پر۔'' اب کے اُس نے آہستہ سے وضاحت دی۔ وہ اُسکا محسن تھا۔ وہ بھلا اُس سے اس طرح کیسے بات کر سکتا تھا؟

''میں نے تمہیں ڈھونڈا تھا رضا! بہت ڈھونڈا تھا۔ ہر اُس جگہ جہاں تمہارے ملنے کی اُمید تھی۔۔۔'' حسین نے کھوئے کھوئے سے لہجے میں کہا تھا۔ رضا کا دل دکھنے لگا، وہ اور اس انسان سے نظریں نہیں چرا سکتا تھا۔ ذہن کے پردے پر وہ خوفناک یاد چلنے لگی۔

وہ سلاخوں کے پیچھے گزاری ہوئی ایک رات۔۔۔

وہ جیل کی ٹھنڈے فرش پر اُسکے برف ہوتے پاؤں۔۔۔

وہ عزت نفس کو مجروح کرتی ہنسی۔۔۔

وہ انا پر پڑتی چوٹ۔۔۔

وہ چیخ چیخ کر بیٹھتی ہوئی آواز۔۔۔

وہ بے بس انسان۔۔۔۔

وہ ایک۔۔۔اکیلا انسان۔۔۔

---------+--------+--------

''میں نے تمہیں ڈھونڈا تھا مقدّم ! بہت ڈھونڈا تھا۔ ہر اُس جگہ جہاں تمہارے ملنے کی اُمید تھی۔۔۔۔''الفاظ وہی تھے، جذبات بھی وہی تھے، احساسات بھی وہی تھے، پر منظر بدل گیا تھا۔ مکالمے وہی تھے پر کردار بدل گئے تھے۔ اُسی وقت، اُسی لمحے حسین کی جگہ مقدّم مہمان ہوا تھا، رضا کی جگہ عمر میزبان ہوا تھا۔ فلیٹ کی جگہ عمر کے گھر نے لے لی تھی، وہی پرانا گھر جہاں مقدّم اکثر آیا کرتا تھا۔

دونوں منظر ناموں میں فرق صرف اتنا تھا کہ حسین نے خود کو خود ہی مہمان بنایا تھا، جبکہ مقدّم کو عمر نے باقاعدہ چائے پر مدعو کیا تھا۔ اور اُسکی گمشدگی پر اپنی بے بسی بتانے والا خود عمر تھا۔

''میں جانتا ہوں کہ تم نے مجھے کتنا ڈھونڈا ہو گا؟ پر میرے حالات بھی تو تمہیں معلوم ہو چکے ہیں۔''اُس نے آہستہ سے کہا۔ عمر کا خالی گھر دیکھ کر اُسے عجیب سی وحشت ہو رہی تھی۔ وہ حیران تھا کہ وہ اکیلا کیوں ہے؟ یا شاید اُسکے گھر والے کہیں گئے ہوئے ہیں؟ سوال تو بہت تھے پر وہ پوچھنے سے گریزاں تھا۔

''پتہ نہیں یہ سب کیوں ہوا؟ قسمت کے فیصلے کبھی کبھی سمجھ ہی نہیں آتے۔''کرسی کے ہاتھ پر انگلیاں پھیرتا عمر کچھ کھوئے کھوئے سے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''ہر شخص کے پاس اپنی کہانی ہے، سب کی اپنی وجوہات ہیں۔ تم نے مجھے جھگڑے والی بات بتائی۔ پر یہ نہیں بتایا کہ رضا نے علی کو کیا کہا تھا؟''مقدّم آج شاید تمام ابہام دور کرنا چاہتا تھا۔

''میں نے تمہیں بتایا تھا کہ جب رضا، نوید اور علی کا جھگڑا ہوا تب میں وہاں نہیں تھا۔ مجھے بس اتنا معلوم ہے کہ نوید کیس سے پیچھے ہٹنا چاہتا تھا اور تم چلے گئے تھے ان دونوں باتوں پر علی بہت غصّہ تھا اور اس نے سب سے کافی بدزبانی کی تھی۔ اُس نے نوید کو خود غرض، مفاد پرست اور نہ جانے کیا کیا کہا تھا؟ رضا کو بھی اُس پر غصّہ آیا تھا اور اس نے بھی اُسے ٹھیک ٹھاک برا بھلا تھا۔ الفاظ تو میں نہیں جانتا پر جھگڑے کی نوعیت کافی زیادہ تھی، یہ مجھے خضر نے بتایا تھا اور خضر کو حسین نے۔۔۔''

''اور حسین نے خضر کو تمام بات نہیں بتائی تھی۔'' مقدّم نے یکدم ہی کہا۔

''میں جانتا ہوں۔'' اُس نے سکون سے جواب دیا تو وہ حیران ہوا۔

''کیا تم تمام بات جانتے ہو؟''

''نہیں! مجھے بس اتنا اندازہ ہے کہ حسین نے خضر کو تمام بات نہیں بتائی ہو گی۔ کیونکہ جب خضر مجھے یہ تمام بات بتا رہا تھا اُسی لمحے مجھے احساس ہوا کہ جھگڑا اتنا بڑا نہیں تھا کہ اس پر تعلقات ختم کر دیئے جائیں، اُسکی تمام بات میں بہت سے جھول تھے۔ پھر میں اس نتیجے اور پہنچا کہ یقیناً حسین نے اُسے مکمل بات نہیں بتائی ہے۔'' اُس نے آہستہ سے کہا تو مقدّم گہری سانس لیکر پیچھے ہوا۔

''جب میں نے تم سے جھگڑے والی بات سنی تھی تو میرے لیے بھی یقین کرنا مشکل ہو گیا تھا کہ اتنی سی بات پر اتنا شدید جھگڑا کیسے ہو سکتا ہے؟ مجھے بھی تمہاری کہانی میں جھول محسوس ہوا۔ اسی لیے میں حسین سے ملا۔''

''حسین سے؟'' وہ سیدھا ہوا۔

''ہاں! ملاقات اتفاقیہ تھی پر میں نے سوچا کہ کہیں بیٹھ کر بات کی جائے، میرے کچھ شبہات تھے جو میں دور کرنا چاہتا تھا۔''

''تو دور ہوئے؟'' وہ جانچتی نظروں سے مقدّم کو دیکھنے لگا جبکہ مقدّم بغور اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔

''جھگڑے سے متعلق تو تمام شبہات دور ہو گئے اُس نے مجھے تفصیل سے سب بتایا کہ اُس روز در حقیقت ہوا کیا تھا۔''

''کیا بتایا اُس نے؟'' عمر بھی اصل بات سننا چاہتا تھا۔ جواباً اُس نے تمام بات بتا دی۔

''یار! مجھے یقین نہیں آ رہا کہ ان لوگوں نے ایک دوسرے پر اس حد تک گرے ہوئے الزامات لگائے تھے؟'' وہ شاکڈ رہ گیا۔ یہ تو اُسکے فرشتوں نے بھی نہیں سوچا تھا۔

''میں تو بس اتنا جانتا تھا کہ اُس نے نوید کو کیس سے پیچھے ہٹنے پر خود غرضی کا طعنہ دیا تھا پر یہ صنوبر والی بات۔۔۔'' اُسے یقین کرنے میں مشکل ہو رہی تھی۔

''تمام باتوں کے ذمے دار فقط دو ہی لوگ ہیں۔ ایک علی اور دوسرا رضا۔۔۔'' مقدّم نے چائے کی پیالی لبوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

''ان دونوں کا حال تو آج بھی ایسا ہی ہے۔ پتہ نہیں کب سدھریں گے ؟''پہلی بار عمر نے چڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

''دونوں آج بھی ایک دوسرے سے اُلجھ رہے تھے۔ معلوم نہیں اتنی عدم برداشت کیوں ہے ان دونوں میں۔''اُسے دونوں پر ہی غصّہ آرہا تھا۔ اگر جو دونوں ہی اُس دن تھوڑا تحمل سے کام لے لیتے تو معاملہ یہاں تک نہ آتا۔

''جھگڑے کے متلعق تمام حقائق معلوم ہو گئے پر کچھ شبہات اب بھی ہیں جنہیں صرف تم دور کر سکتے ہو۔''مقدّم نے یکدم ہی سنجیدگی سے کہا تو عمر حیران ہوا۔

''میں ؟''

''حسین نے مجھے بتایا کہ اُسے خضر کیوں ملا تھا۔'' وہ توڑ توڑ کر بات کر رہا تھا یا تمہید باندھ رہا تھا؟

''کیا بتایا اُس نے ؟''عمر کو اپنی سانس اٹکتی محسوس ہوئی۔

''یہی کہ باقی سب کی طرح تمہارے گھر والے بھی تمہارے اچانک بیرونِ ملک جانے کی وجہ سے لاعلم ہیں۔ اور یہ کہ۔۔۔۔''وہ رکا، عمر کا سانس بھی رکا۔

''کہ ؟''

''یہ کہ تم نے چار سال تک اپنے ماں باپ سے بھی کوئی رابطہ نہیں کیا۔ کیوں ؟''

''ایسی بات نہیں ہے، شاید خضر ٹھیک سے بتا نہیں سکا ہو گا۔''اُس نے بات گھمائی۔

''خضر کہاں ہے ؟''اُس نے پوچھا۔

''خضر اب میرے ساتھ نہیں ہے۔''اُسکے جواب پر مقدّم نے ناسمجھی سے اُسے دیکھا۔

''عمر! کیا چھپا رہے ہو تم ؟ میں کب سے۔۔۔''

اس سے پہلے کہ وہ مزید کوئی کوئی سوال کرتا عمر کے اگلے جملے نے اُسے ساکت کر دیا۔

''میں ملک سے باہر کیریئر بنانے نہیں گیا تھا۔ جان بچانے گیا تھا۔''

---------+---------+--------

حالانکہ وہ سحری کاالارم لگا کر سویا تھا پر اُسکی آنکھ الارم بجنے سے پہلے ہی کھل گئی۔ اُس نے آنکھیں ملتے ہوئے وقت دیکھا پھر اٹھ بیٹھا۔ نشمیہ پاس ہی سکون سے سوئی ہوئی تھی۔ اُس نے گہری سانس لیکر ماتھا مسلا طبیعت اب قدرے بہتر تھی پر سر میں درد ابھی بھی تھا۔ ہاتھ کی پشت پر بندھی سنی پلاسٹ اُتارتے ہوئے اُس نے پاس رکھا موبائل اٹھایا۔ ای میل پر بلڈ ٹیسٹنگ لیب والوں کا پیغام آیا پڑا تھا۔ اُسکا دل دھڑکا، جب اُسے رپورٹ کا انتظار تھا تب آئی نہیں، اور جب انتظار نہیں رہا تو رپورٹ سامنے تھی۔ یہ وہ شے تھی جس سے وہ نظریں چراتا آرہا تھا۔

اُس نے کانپتے ہاتھوں کے ساتھ فائل ڈاؤنلوڈ کی اور اُسے کھولا۔ اندھیرے کمرے میں اگر کوئی شے روشن تھی تو وہ موبائل کی روشنی میں نظر آتا اُسکا چہرہ تھا۔ جو اس وقت فق ہو چکا تھا، کتنے ہی لمحے وہ بے یقینی سے رپورٹ دیکھتا رہا۔ اگلے ہی لمحے غصّے کا اُبال اٹھا تھا اُسکے اندر، غصّہ بھی ایسا کہ سامنے آئی ہر شے جلا کر راکھ کر دے۔ جس بات سے وہ ڈرتا آرہا تھا وہ ہو گئی تھی، جس شے سے نظریں چرا رہا تھا وہ سامنے آچکی تھی۔ اب احساس زیاں کا کاری وار دل پر محسوس کیے وہ تن فن کرتا، وقت کا لحاظ کیے بغیر سفیر صاحب کے کمرے کی طرف دوڑا۔ وہ جاگ رہے تھے، نہ بھی جاگ رہے ہوتے تو بھی علی آج اُنہیں اٹھا دیتا۔

جو بات وہ کرنے آیا تھا وہ عام نہ تھی۔ اُسے سامنے دیکھ کر وہ حیران کم پریشان زیادہ ہوئے تھے۔ اُسکا چہرہ اور آنکھیں خطرناک حد تک سرخ ہو رہی تھیں۔ کچھ تو برا ہوا تھا یقیناً، اُسکا انداز ایسا تھا جیسے آتش فشاں سے بھرے پہاڑ سے لاوا پھوٹ پڑے۔ اُنکا دل زور سے دھڑکا۔ کیا ہوا تھا آخر؟

''جھوٹ بولا اُس نے ہم سے۔۔۔بے وقوف بنایا ہمیں۔۔۔'' علی کے جملے بے ربط سے تھے۔ نہیں! آج وہ چیخ نہیں رہا تھا۔ آج اُسکا گلا رندھ رہا تھا، آنسوں اُمڈ اُمڈ کے باہر آرہے تھے۔ یہ چوٹ اب تک کی سب سے گہری چوٹ تھی۔

''کس کی بات کر رہے ہو؟ کس نے بیوقوف بنایا ہمیں؟'' اُنہوں نے کانپتے لہجے میں پوچھا۔

''فاطمہ!۔۔۔فاطمہ آفندی۔۔۔آپ کی پسندیدہ بہو۔۔۔جسے آپ نے میری زندگی برباد کرنے کے لئے چنا تھا۔جھوٹی تھی وہ۔۔۔اور ہے۔۔۔اور ہمیشہ رہے گی۔اُس نے ہمیشہ کی طرح جھوٹ بولا،دھوکہ دیا۔۔۔''وہ رو رہا تھا۔اور وہ سن سے بیٹھے تھے۔

''وہ عورت۔۔۔جسے میرے منع کرنے کے باوجود آپ نے دوبارہ گھر میں آنے دیا۔اُسے میرے بیٹے کو لیجانے دیا۔ہاں!وہی عورت ہمیں بیوقوف بناتی رہی ہے۔''

''کاک۔۔کیا۔۔کیا کہہ رہے ہو؟''وہ الفاظ ادا نہیں کر پا رہے تھے۔کیا ہو رہا تھا آخر؟

''یہ لیں،دیکھیں یہ رپورٹ۔۔۔یہ ڈی این اے رپورٹ ابّا!''وہ موبائل اُنکے حوالے کرتا خود فرش پر بیٹھ کر رونے لگا تھا۔

وہ رو رہا تھا۔۔۔

دھاڑے مار مار کر رو رہا تھا۔۔۔۔

ایسے تو وہ فاطمہ کے جانے پر بھی نہیں رویا تھا۔۔۔۔

اُنہوں نے کپکپاتے ہاتھوں سے سکرین کھولی۔۔۔۔

اُنکے حواس سلب کرتی۔۔۔۔

سچ کا پتہ دیتی۔۔۔۔

اندھیرے میں روشن ہوتی سکرین۔۔۔۔۔

---------+---------+--------

دس سال قبل:

وہ گلیوں میں، کوچوں میں حقیقتاً مارا مارا پھر رہا تھا۔ اُسکی نیندیں ختم ہو گئی تھی، کھانا پینا نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ دماغ کو کچھ یاد تھا تو بس یہ کہ اُسکا دوست لاپتہ ہے۔ وہ ہر جگہ مقدّم کو تلاش کر رہا تھا۔ یونیورسٹی کے ڈیپارٹمنٹ میں، اُسکے گھر کے باہر چکر لگا کے، اُسکے آفس میں، اُسکے سابقہ آفس حتیٰ کہ اُس کے باپ کے آفس میں بھی۔۔۔

ہر جگہ سے ایک ہی بات معلوم ہوئی، وہ یہ کہ پورا خاندان بنا بتائے غائب ہو گیا تھا۔ حتیٰ کہ اُسے غائب ہوئے چار ماہ ہو گئے، پر عمر اُسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے نہیں تھکا، اُس نے خود کو ہلکان کر لیا، کئی کئی وقت کا کھانا چھوڑ دیا پر اُسکی تلاش نہ چھوڑی۔ یہاں تک کہ نوید اور حسین نے ہی اُسے سمجھایا کہ وہ اپنے ساتھ اس طرح نہ کرے۔ اُسکے گھر والوں کا بھی اُس پر حق ہے، مقدّم کو ملنا ہو گا تو وہ مل ہی جائیگا۔ وہ اُنکی باتیں سنتا پر کہتا کچھ نہیں، سمجھ نہیں آتا کہ خود کو کیسے سمجھائے؟ علی کو تو مقدّم کا کوئی ہوش ہی نہ تھا۔ وہ فقط صنوبر کو انصاف دلانے کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔

اُس روز خضر نے اُسکے آگے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیئے۔

''مجھے بتاؤ عمر! کیا مقدّم مجھ سے زیادہ پیارا تھا تمہیں؟ کیا تم اسی طرح ہمیں اذیت دیتے رہو گے؟'' اُس نے پوچھا۔

''ایسی بات نہیں ہے۔'' اُس نے سر جھکا کر آہستہ سے کہا۔

''تو پھر ایسا کیوں کر رہے ہو؟ تمہاری زندگی میں مقدّم سے زیادہ اہم لوگ بھی ہیں۔ میں ہوں، امی ابو ہیں، اور عمارہ کا کیا؟ کیا تم ایک دوست کے لیے ہم سب کو گنوانا چاہتے ہو؟'' اُس نے غصّے سے کہا تو عمر نے تڑپ کر اُسے دیکھا۔

''ایسے مت کہو خضر! میرے لیے تم سب دنیا کی کسی بھی شے سے زیادہ اہم ہو۔''

''تو مت کرو پھر ہمارے ساتھ ایسا۔ بھول جاؤ مقدّم کو، تم اُسکے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ قسمت میں لکھا ہو گا تو وہ تمہیں مل جائے گا۔'' اُس نے تھک کر کہا تو عمر کو احساس ہوا کہ وہ واقعی اپنے گھر والوں کے لیے تکلیف کا باعث بن رہا ہے۔ وہ تو ویسے ہی حساس تھا۔ اپنے سے زیادہ دوسروں کا سوچتا تھا۔ اُس روز اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ مقدّم کی تلاش اب ختم کر دے گا۔ وہ اپنے گھر والوں کو تکلیف نہیں پہنچا سکتا تھا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ شاید میں زیادہ ہی سوچنے لگا تھا۔ اب سے شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔'' اُس نے آہستہ سے کہا۔

"ہمیں تم سے شکایت نہیں ہے عمر! ہم سب تم سے بہت محبت کرتے ہیں۔ ایسے نہیں دیکھ سکتے تمہیں۔ پلیز! اس کمرے سے باہر نکالو خود کو۔ امی ابو، تمہاری شادی کی تاریخ طے کرنے کا سوچ رہے ہیں، تم اُسکے بارے میں سوچو اور خدا کے لیے! خوش رہنے کی کوشش کرو۔ اپنے لیے نہ صحیح ہمارے لیے صحیح۔۔۔" اُس نے اُسکے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے سمجھایا تھا۔ خضر، عمر کو مقدّم سے زیادہ پیارا تھا۔ اس میں کوئی دورائے نہیں تھی۔ اور وہ اپنے بھائی کو تکلیف نہیں پہنچا سکتا تھا۔ اُس روز اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنی زندگی کے معاملات کو دوبارہ وہیں سے شروع کریگا، جہاں سے مقدّم کے جانے کے بعد روکا تھا۔

لیکن وہ کہتے ہیں نہ کہ کسی بھی شے کی زیادتی اچھی نہیں ہوتی، اُسکا حد سے زیادہ حساس ہونا اور اُسکا حد سے زیادہ دوسروں کے بارے میں سوچنا اُسے لے ڈوبنے والا تھا۔

بہت بری طرح۔۔۔

--------+---------+----------

اُس روز وہ علی کے گھر آیا تھا، علی یقیناً صنوبر کیس کے متعلق اُن سب سے بات کرنا چاہتا تھا۔ اُسکا ارادہ تھا کہ اب وہ کیس پر بھی دھیان دے گا، کب سے علی کو اکیلے ہی سب کچھ دیکھنا پڑ رہا تھا۔ وہ ساتھ میں مٹھائی بھی لایا تھا۔ اپنی تاریخ طے ہونے کی خوشی میں، اُنہیں لگے ہاتھوں دعوت دینے کا ارادہ رکھتا تھا۔ ٹھیک ہے! مقدّم کی کمی ہمیشہ رہنے والی تھی، لیکن اُسکے باقی چاروں دوست تو موجود تھے ناں؟

آج کل اُسکا دماغ بھی کم کام کر رہا تھا، وہ مٹھائی کا ڈبہ گاڑی میں ہی بھول کر اندر داخل ہو گیا تھا، اور اُسی لمحے اُس نے دیکھا کہ نوید اور علی کسی بات پر جھگڑ رہے تھے۔ اور وہ بھی بہت بری طرح۔۔۔

اُسکے لیے یہ منظر ناقابلِ یقین تھا، کیونکہ نوید اور علی گہرے دوست تھے، جھگڑا تو دور کی بات اُن دونوں میں کبھی تلخ کلامی بھی نہ ہوئی تھی۔ علی غصّے کا تیز تھا، اور نوید تحمل مزاج، دونوں کی ہی آپس میں گاڑھی چھنتی تھی۔ پر آج جس طرح وہ جھگڑ رہے تھے، وہ باعثِ حیرت تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتا علی کے کہے اگلے جملے نے اُسکے اندر آگ ہی لگا دی تھی۔ اُس نے موضوع سے بلکل ہٹ کر مقدم کی گمشدگی کو نشانہ بنایا تھا، اور اُسے مفرور کہا تھا۔

وہ نہیں جانتا کہ اُس لمحے اُسے کیا ہوا؟ اُسکی پچیس چھبیس سالہ زندگی میں ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ وہ اس طرح حلق کے بل چیخا ہو، ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ اُس نے کسی کا گریبان پکڑا ہو اور وہ بھی اپنے دوست کا، ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ اُس نے اتنے برے الفاظ استعمال کیے ہوں۔ پر اُس روز ایسا ہو گیا تھا، اُسے خود بھی نہیں یاد کہ وہ اُس روز کیا کیا بول گیا تھا؟ بس ایسا لگ رہا تھا کہ کوئی آگ تھی اُسکے اندر جو اُس روز باہر نکل گئی تھی۔ وہ نرمی سے بات کرنے والا لڑکا اُس لمحے نہ جانے کیا کچھ کہہ گیا تھا؟ اُسے حسین اور رضا نے وہاں سے ہٹایا تھا، وہ غصّے سے باہر نکل گیا۔ اُنہیں اپنی شادی کی دعوت بھی نہ دے سکا اور وہاں سے نکل پڑا۔ بے انتہا تیز گاڑی چلاتے، اُسے احساس ہی نہیں تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے؟

پر اُس لمحے اُسکے ساتھ وہ ہوا جو پچھلے کئی ہفتوں سے ہو رہا تھا، اور وہ نظر انداز کر رہا تھا۔ اُسکی آنکھوں کے سامنے چند لمحوں کے لیے گھپ اندھیرا چھایا اور گاڑی درخت سے جا ٹکرائی۔ جب اُسے ہوش آیا تو وہ ہسپتال میں تھا، خضر پاس ہی کھڑا ڈاکٹر کی بات سن رہا تھا۔

''شکر ہے کہ کوئی خاص چوٹ نہیں آئی لیکن چونکہ یہ بے ہوش ہو گئے تھے۔ اس لیے ہم نے سٹی سکین کرنا مناسب سمجھا۔'' ڈاکٹر اُسے بتا رہا تھا۔

''کوئی خطرے والی بات تو نہیں ہے؟'' خضر فکر مند ہوا۔

''نہیں! نہیں۔۔۔ یہ بس ہماری تسلی کے لیے ہے۔'' ڈاکٹر چلا گیا تو وہ اُسکے پاس آیا۔

''تم ٹھیک ہو؟'' فکر مندی سے اُسے دیکھا۔

''ہاں! کیا ہوا ہے مجھے؟'' اُس نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

''ایکسیڈنٹ اور کیا؟ مجھے بتاؤ تم کب سے اتنی تیز گاڑی چلانے لگے؟'' اب کہ وہ خفا ہوا۔

''مجھے بس گھر آنے کی جلدی تھی، اتنے کام ہیں کرنے کو۔'' اُس نے جھوٹ بولا۔

''جتنے بھی کام ہوں۔ کیا میں نہیں تھا گھر پر؟ آرام سے گاڑی چلایا کرو عمر!''

''گھر میں تو نہیں بتایا کسی کو؟'' اب کے اُسے گھر والوں کی فکر ہوئی۔

''نہیں! ہسپتال سے مجھے ہی کال آئی تھی تو میں بنا بتائے یہاں آگیا۔ بتا دیتا تو تم اگلے کئی دنوں تک مجھے کوستے رہتے کہ کیوں سب کو پریشان کر دیا؟'' اس بات پر وہ ہنسا۔

''اچھا چلو! اب گھر چلتے ہیں۔ میں ٹھیک ہوں پہلے سے۔'' وہ کھڑا ہونے لگا۔

''بلکل ٹھیک نہیں ہو۔ دائیں ہاتھ میں موچ آئی ہے۔ شکر ہے کوئی فریکچر نہیں ہے۔ آرام کرنا ہے تمہیں کچھ دن۔''

''گھر تو جا سکتا ہوں ناں؟''

''ہاں! بس ہم چلتے ہیں کچھ دیر میں۔'' اور کچھ دیر میں وہ دونوں وہاں سے گھر کی جانب چل پڑے۔ اتنے خطرناک حادثے میں اُسکا بچ جانا کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔ گاڑی خضر نے بننے بھجوا دی تھی، خود اُس نے مختصراً گھر والوں کو حادثے کا بتا دیا اور اب مکمل آرام پر تھا۔ اُس نے اپنے دوستوں میں سے کسی کو فون نہیں کیا۔ اُمید تھی کہ وہ لوگ خود پوچھیں گے، پر اُسے دُکھ تب پہنچا جب اُسکے دوستوں میں سے کسی نے بھی اُسے ایک میسج تک کر کے نہیں پوچھا کہ وہ اتنے دنوں سے کہاں غائب ہے؟

اُس روز وہ دونوں ہسپتال سے آتے ہوئے سٹی سکین کی رپورٹ لینا بھول گئے تھے، اور گھر میں شادی کی تیاریاں ہونے کے باعث کسی نے اس طرف دھیان بھی نہ دیا۔

شادی تو ابھی تین ماہ بعد تھی۔۔۔

پر کیا وہ ہونے بھی والی تھی؟

----------+---------+--------

اُس روز وہ اپنے اور خضر کے مشترکہ کمرے میں تھا جو بہت جلد اب صرف خضر کی ملکیت ہونے والا تھا۔ حادثے کے بعد سے وہ اب تک آرام ہی کر رہا تھا۔ دوستوں میں سے کسی نے خیر خبر نہ لی تھی۔ وہ ٹھیک ٹھاک مایوس تھا کہ تب ہی پاس بجتے موبائل نے اُسکی توجہ اپنی جانب مبذول کروائی۔

اُس نے دیکھا تو خضر کا موبائل بج رہا تھا۔ خود وہ کسی کام سے گھر سے باہر گیا ہوا تھا، اور فون یہیں چھوڑ گیا تھا۔ سکرین پر نظر آتا نمبر انجان تھا۔ اُس نے نظر انداز کر دیا۔ کال دوبارہ آنے لگی۔

''کہاں چلا گیا ہے یہ فون چھوڑ کر؟'' وہ جھنجھلایا۔ پھر نہ چاہتے ہوئے بھی فون اٹھا لیا۔

''ہیلو!''

''السلام علیکم! میں ہلال ہسپتال سے بات کر رہا ہوں۔ آپ خضر حفیظ ہیں؟'' دوسری طرف سے کہا گیا تو ہسپتال کا نام سن کر وہ چونکا۔

''ہسپتال سے؟ خیریت؟'' وہ پریشان ہوا، بھلا خضر کا ہسپتال میں کیا کام؟

''آپ پچھلے دنوں اپنے بھائی عمر حفیظ کو کسی حادثے کی وجہ سے ہسپتال لائے تھے۔ اُنکا سٹی سکین ہوا تھا، جس کی رپورٹ آپ لوگوں نے نہیں لی۔'' دوسری طرف کی بات سن کر وہ تھوڑا مطمئن ہوا۔

''ارے وہ رپورٹ؟ اُسکی اتنی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی تو ہم نے۔۔۔''

''ضرورت ہے سر! آپکو اُس رپورٹ کی فوراً ضرورت ہے۔'' دوسری جانب سے اُسکی بات کاٹی گئی تو وہ ساکت ہوا۔

''کیا مطلب ضروری ہے؟'' اُس نے محتاط انداز میں پوچھا، دل کسی انجانے خدشے کے تحت دھڑکنے لگا۔

''آپ ہسپتال آئیے، بلکہ اپنے بھائی عمر کو بھی ساتھ لے کر آئیے۔ اُن کی رپورٹ کے حوالے سے کچھ باتیں آپکو بتانی ہیں، جو آپکا جاننا ضروری ہے۔'' وہ اُسے خضر سمجھ رہا تھا۔

''کیا کوئی۔۔۔ کوئی مسئلہ والی بات ہے؟'' اُس نے یہ سوال پوچھنے کی ہمت کیسے جمع کی تھی وہ ہی جانتا تھا۔

''سر! میں نہیں جانتا، مجھے بس اتنا معلوم ہے کہ ڈاکٹرز کا پینل بیٹھا تھا آپکی رپورٹس کے لیے اور اُنہوں نے ہی آپکو بلوایا ہے۔'' اُسکا دل رکا پھر دھڑکا، پھر رکا اور اب کے دھڑکا تو اتنی زور سے جیسے پسلیاں توڑ کر باہر آجائے گا۔

''مجھے کب تک آنا ہے؟'' اُس نے ہمت مجتمع کر کے پوچھا۔

''آپ ابھی آ سکتے ہیں؟''اُس نے پوچھا۔ عمر کو بہت اچھے سے سمجھ آ رہا تھا کہ کچھ برا ہو چکا ہے۔

''ٹھیک ہے! میں آتا ہوں، لیکن آپ سے ایک گزارش ہے۔''

''جی سر! کہیے؟''

''آپ دوبارہ اس نمبر پر کال مت کیجئے گا۔''اُس نے مختصراً کہا۔ ابھی وہ کسی کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''جیسے آپ مناسب سمجھیں۔''اُس نے کہا اور پھر فون رکھ دیا۔ عمر نے فوری طور پر خضر کے موبائل سے نمبر اپنے پاس لیا اور کال لاگ ڈیلیٹ کر دیا۔ پھر گہری گہری سانس لے کر خود کو نارمل کرنے لگا۔

''ایک تو ہر کام میرے سر پر ڈال دیے ہیں سب نے، موبائل بھی گھر پر ہی بھول کر چلا گیا تھا میں۔''اُسی لمحے خضر بولتا ہوا اندر داخل ہوا، اُسے دیکھ کر چونکا۔

''تمہیں کیا ہوا؟''اُسکی اُڑی رنگت دیکھ کر پوچھا۔

''کک۔۔کچھ نہیں۔۔۔مجھے ذرا علی کی طرف جانا ہے۔''وہ چابی اٹھاتے ہوئے کھڑا ہوا۔

''ارے! کیوں بھئی؟''

''اتنے دنوں سے ملا نہیں اُس سے۔۔۔''اُس نے جھوٹ بولا۔

''تو اتنے دنوں سے تمہارے دوست کو تم یاد کیوں نہیں آئے؟'' اُس نے کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے مشکوک نظروں سے دیکھا۔

''وہ۔۔۔وہ صنوبر کا کیس چل رہا ہے ناں!''اُس نے بہانہ گھڑا۔

''میں نے کہا بھی ہے ابھی ان سب چیزوں سے دور رہو۔''وہ چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔

''بس کر دو! معذور نہیں ہو گیا ہوں میں کہ گھر سے باہر بھی نہیں نکل سکتا۔''وہ جھنجھلایا۔

''اچھا ٹھیک ہے! پر جلدی آنا۔''اُس نے ہار مان لی تو عمر بھی خدا حافظ کہتا ہوا تیزی سے باہر نکل گیا۔

زندگی میں کچھ طوفان بنا اطلاع کے آتے ہیں۔۔۔

عمر کے ساتھ بھی ایسا ہی ہونے والا تھا۔۔۔

بلکہ شاید۔۔۔

اُسکے تمام پیاروں کے ساتھ۔۔۔

----------+---------+--------

جو اُس نے سنا اُس پر یقین کرنا مشکل تھا۔

پر جو اُسکے سامنے تھا وہ اٹل تھا۔

جو اُس نے سوچا وہ تو کم تھا، پر

جو ہو گیا تھا وہ اُسکے تصوّرات میں بھی نہ تھا۔

وہ ہسپتال آیا تو ڈاکٹر نے ایم آر آئی کرنے کا کہا، وہ نقد رقم نہیں لایا تھا، پر شکر کے کارڈ تھا اُسکے پاس، اُس نے فوراً ہی ایم آر آئی کروائی، وہ تھوڑا تھوڑا خود کو، آنے والے حالات تسلیم کرنے کے لیے راضی کر رہا تھا۔ ڈاکٹر نے اس سے پوچھا کہ حادثہ کیسے ہوا تھا؟ اُس نے سچ سچ بتا دیا کہ اُسکی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا تھا۔ ڈاکٹر نے جب سوال کیا کہ ایسا کب سے ہو رہا ہے تو وہ چند لمحوں کو بول نہ سکا، ایسا کافی مہینوں سے ہو رہا تھا اور وہ نظر انداز کر رہا تھا۔

پر جو ڈاکٹر نے کہا اُس نے اُسکے حواس سلب کر دیئے تھے۔ کتنے لمحوں تو وہ بول نہ سکا۔ ڈاکٹر اُسے پانی کا گلاس آگے بڑھا رہا تھا، کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پر دماغ میں جیسے آوازیں آنا بند ہو چکی تھیں۔

Brainstem Glioma

ایک ایسا ٹیومر جو دماغ کے اس حصے میں ہوتا ہے جو سارا جسم کنٹرول کرتا ہے۔ یعنی حرام مغز۔۔۔

''آپکا ٹیومر اتنا بڑا ہو چکا ہے کہ اگر اسے نکالا نہ گیا تو اسکے ساتھ آپ چند ماہ سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتے ،اور اسے ایسی سرجری کے ذریعے نکالا گیا تو۔۔۔''ڈاکٹر رکا، عمر خاموش۔۔۔۔

''تو بھی سرجری کے کامیاب ہونے کے چانسز پانچ فیصد ہیں۔ سرجری کے دوران آپکی جان جانے کے امکانات بہت قوی ہیں۔''وہ کیا کہہ رہا تھا؟اُسے موت کی خبر سنا رہا تھا؟وہ کیا بتا رہا تھا؟یہ کہ ہر راستہ موت کی طرف جا رہا ہے ؟

''آپ پر سکون ہو جائیں،اور کچھ دیر دماغ کو آرام دیں۔بلکہ میری مانیے تو کچھ دیر کے لیے باہر جائیں،پُر سکون دماغ کے ساتھ تمام باتوں پر غور۔۔۔''پتہ نہیں یہ ڈاکٹر کیا کہہ رہا تھا؟بھلا اب وہ پر سکون ہو سکتا تھا؟

''میری شادی ہے تین ماہ بعد۔۔۔میرے ماں باپ مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔مجھے ابھی۔۔۔ابھی اپنے دوست کے کیس میں گواہی دینی ہے۔۔یہ۔۔۔یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟''وہ بے ربط سی باتیں کر رہا تھا۔ڈاکٹر کو اُس پر ترس آیا۔

''پانی لیجئے۔''اُس نے گلاس آگے بڑھایا۔عمر نے تھام لیا۔

''کیا۔۔۔کیا کسی قسم کا۔۔۔کوئی علاج نہیں ہے؟''وہ جب بولنے کے قابل ہوا تو یہی پوچھ سکا۔خوف کے بعد اُمید۔۔۔ایک آخری امید۔۔۔

''آپکے یہاں آنے سے پہلے ہم تمام ممکنہ امکانات پر غور کر چکے ہیں۔جو بیماری آپکو ہے اُسکا ایک علاج دریافت ہو چکا ہے۔آپکے پاس وقت کم ہے،لہٰذا اگر آپ ارجنسی لیٹر کے ذریعے فوری ویزا حاصل کر کے جرمنی جاتے ہیں تو آپکا فوری علاج شروع ہو جائیگا۔''ڈاکٹر نے صاف الفاظ میں بات نہیں کی تھی یا شاید اُسے ایسا لگا تھا۔

''میں کچھ سمجھا نہیں،ابھی آپ کہہ رہے تھے کہ علاج نہیں،اب آپ کہہ رہے ہیں کہ علاج ہے۔اور وہ بھی جرمنی میں؟آپ کھل کر کہیں کہ کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

''آپ علاج کروانا چاہتے ہیں؟''ڈاکٹر نے گہری سانس لیتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں!کیوں نہیں؟خواہ کتنے ہی پیسے کیوں نہ لگیں۔''اُس نے جلدی سے کہا،ایک مُبہم سی اُمید ملی تھی۔

''پیسے نہیں ہیں، علاج مفت ہے۔''ڈاکٹر کی اگلی بات اُسکے لیے مزید حیران کن تھی۔ جہاں تک اُسے یاد تھا کہ جرمنی میں علاج مفت نہیں ہوتا تھا۔ پھر؟

''کیا مطلب؟ آپ مجھے اُلجھا رہے ہیں۔''وہ تنگ ہوا۔

''ہم آپکو، کلینیکل ٹرائل پر بھیجنا چاہتے ہیں۔''اُسے کسی نے اٹھا کر سمندر میں پھینک دیا تھا، اور وہ بھی اتنی اونچائی سے کہ سمندر کی گہرائی تک پہنچنے سے پہلے ہی اُسکی موت واقع ہو جائے۔

''آپ۔۔۔آپ مجھے۔۔۔مجھے تجربے کے لیے بھیجنا چاہتے ہیں؟''اُسے اپنی آواز کھائی سے آتی محسوس ہوئی۔

''ہاں!۔۔۔''ڈاکٹر نے صاف گوئی سے کہا۔

''مجھے مزید بات نہیں کرنی۔۔۔''وہ بے یقینی سے سر ہلاتے پیچھے کو ہوا تاکہ جانے کے لیے کھڑا ہو سکے۔

''یہ کامیاب تجربہ بھی تو ہو سکتا ہے عمر!''ڈاکٹر صاحب کی بات پر اُسکا وجود مجسمہ ہوا۔

''ناکام بھی تو ہو سکتا ہے؟''اُسے اُمید نہ تھی۔

''دوسری صورت میں بھی تو موت ہی ہے عمر! ایک بار قسمت آزمالو۔ اگر علاج کامیاب ہو گیا تو تم کیا، تمہارے بعد آنے والے دیگر مریضوں کے لیے بھی اُمید کی ایک کرن بن جائے گی۔''وہ ہل بھی نہ سکا۔

''دیکھو! جرمنی میں بہت دنوں سے اس کے علاج کے لیے ریسرچ جاری تھی، علاج تو دریافت ہو گیا ہے پر تجربہ ابھی باقی تھا۔ ابھی تک کوئی کلینیکل ٹرائل کے لیے تیار نہیں ہوا ہے۔ اُنہوں نے دیگر ممالک میں کلینیکل ٹرائل کے مریضوں کے لیے درخواستیں دی تھیں، جب ہم نے تمہاری رپورٹس دیکھیں تو سوچا کہ۔۔۔''

''سوچا کہ یہ تو بہترین پروڈکٹ ہے تجربے کے لیے، ہے ناں؟ مجھے بتائیے کہ کتنے پیسے دے رہی ہے جرمنی کی حکومت آپ کو اس کام کے؟''اُنکی بات کاٹتے وہ تلخ ہوا۔ ڈاکٹر صاحب اُسکی حالت سمجھ رہے تھے۔

''مجھے اگر پیسے مل رہے ہوتے تو میں تمہیں سچ کیوں بولتا؟ جھوٹ بول کر بھیج دیتا۔ میں نے تمہارے سامنے ایک آفر رکھی ہے۔ باقی مرضی تمہاری ہے۔ گھر جاؤ! اور اس پر غور کرو۔'' اُنہوں نے نرمی سے کہا تو وہ کرسی دھکیلتا اٹھا اور وہاں سے باہر نکل گیا۔

ابھی جو ہوا تھا، ابھی جو زندگی نے اُسکے ساتھ کر دیا تھا۔

اُس پر یقین کرنا مشکل تھا۔۔۔

--------+---------+----------

قدرت نے ہر شے کی ایک حد مقرر کی ہے، اور وہ اسی میں اچھی لگتی ہے۔ ہر شے اپنے مدار میں ہے، کوئی حد سے آگے نہیں بڑھتا۔ سوائے انسان کے۔۔۔۔

جو شے حد سے باہر چلی جائے وہ ہمیشہ نقصان پہنچاتی ہے۔ چاہے وہ ظاہری طور پر کتنی ہی مثبت کیوں نہ ہو۔ عمر حساس تھا، اپنے سے زیادہ دوسروں کا سوچتا تھا۔ یہ دونوں مثبت شے ہیں، پر وہی بات۔۔۔ جب انسانی جذبات بھی حد سے باہر نکل جائیں تو وہ بھی نقصان ہی پہنچاتے ہیں۔

اگلی تین راتیں اُس نے سوچنے میں لگائیں۔ اُسکے پاس سوچنے کے لیے کم وقت تھا، جب موت سامنے کھڑی ہو، اور انسان کو یقین ہو جائے کہ کسی بھی وقت اگلی سانس اُس سے چھین لی جائیگی، تب چاہے اُسے دنیا جہاں کی دولت دے دی جائے، اُسکی تمام خواہشات پوری کر دی جائیں، اُسے اُن سب سے کوئی سروکار نہیں رہتا۔

پر عمر نے اگلی تین سے چار راتیں یہ نہیں سوچا کہ میں خود کو مرنے سے کیسے بچاؤں؟ بلکہ اُس نے یہ سوچا کہ یہ خبر اُسکے گھر والوں کے لیے کیا رنگ لانے والی ہے؟ اُسکا باپ کیا یہ خبر برداشت کر سکے گا؟ کیا اُسکی ماں کے لیے صدمہ قابلِ قبول ہو گا؟ وہ لوگ تو جیتے جی مر جائیں گے۔ اور عمارہ؟ عمارہ کا کیا ہو گا؟ وہ لڑکی جو چند دنوں میں اُسکی زندگی میں آنے والی تھی اُسکا کیا؟ وہ کیا ردعمل دے گی؟

''وہ خود کو قربان کر دے گی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں مرنے والا ہوں، وہ مجھ سے شادی کر لے گی۔ وہ مجھے کبھی نہیں چھوڑے گی اور میرے خاطر اپنی زندگی برباد کر لے گی۔ اُسکے آگے ایک لمبی زندگی ہے۔ وہ کیسے یہ سب جھیلے گی؟'' اُس نے از خود یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ وہ عمر کی خاطر اپنی زندگی برباد کر لے گی۔

''میں۔۔۔میں کسی کو نہیں بتاؤں گا اپنی بیماری کے بارے میں۔۔۔''پہلا فیصلہ ہوا۔لیکن اسکا نتیجہ فوراًہی نظروں کے سامنے آگیا۔

''اگر نہ بتایا تو تین ماہ بعد شادی ہو جائے گی۔نہیں نہیں!یہ صحیح نہیں ہے۔۔۔مجھے شادی روکنی ہو گی۔کچھ ایسا کرنا ہو گا کہ عمارہ میری زندگی میں شامل نہ ہو۔''وہ بھلا کس طرح شادی روک سکتا تھا؟پھر اگلے کئی گھنٹے اُس نے اپنی شادی روکنے کے ہر ممکن امکانات پر غور کیا۔پر کچھ سمجھ نہ آیا۔

آپکے یہاں آنے سے پہلے ہم تمام ممکنہ امکانات پر غور کر چکے ہیں۔جو بیماری آپکو ہے اُسکا ایک علاج دریافت ہو چکا ہے۔آپکے پاس وقت کم ہے،لہٰذا اگر آپ ارجنسی لیٹر کے ذریعے فوری ویزا حاصل کر کے جرمنی جاتے ہیں تو آپکا فوری علاج شروع ہو جائیگا۔

یکدم ہی ڈاکٹر صاحب کی آواز کانوں میں گونجی،ذہن میں ایک کوندا سا لپکا۔''جرمنی''دل نے نام دہرایا۔۔۔وہ جرمنی جا سکتا تھا،بنا کسی خرچے کے،اُسکا ویزا بھی اُسکی حالت کے پیش نظر فوراً آجانا تھا۔اُسکے ابّا کے پیسے بھی اُسکے علاج کیلئے خرچ نہیں ہوں گے۔وہ خاموشی سے یہاں سے چلا جائیگا۔مرنا تو ہے ہی،تو کیوں نہ ایک بار قسمت آزما کر ہی مر جائے؟اور ویسے بھی اس وقت منظر سے غائب ہونے کا اس سے بہتر کوئی راستہ نہ تھا۔اُس نے بیٹھے بیٹھے منصوبہ ترتیب دیا۔

زیادہ سے زیادہ کیا ہو جائیگا؟عمارہ اُس سے نفرت کرنے لگے گی؟تو کر لے۔۔۔وہ عمر کی یاد میں ساری زندگی برباد کر دے،اس سے لاکھ گنا بہتر ہے کہ وہ اُس سے نفرت کرنے لگے۔اور امّاں ابّا؟اُنکا کیا؟کیا اُنہیں سچ بتا دوں؟نہیں نہیں!اُنہیں بتا دیا تو وہ عمارہ کو کبھی نہ کبھی سچ بتا دیں گے،بلکہ اُسکے ساتھ جانے کی ضد کرنے لگیں گے اور معاملہ پھر سے وہیں پہنچ جائیگا جہاں وہ نہیں چاہتا،اُسے امّاں ابّا سے بھی چھپانا ہو گا۔

''اور ویسے بھی جب دورانِ علاج میں مر جاؤں گا اور میرا جنازہ پاکستان آئیگا تب سب مجھے معاف کر ہی دیں گے۔کوئی بات نہیں میں کچھ دنوں کی ناراضگی مول لوں گا۔''وہ اب حد درجہ بے رحمی سے سوچ رہا تھا۔بے رحمی جو صرف اُسکے خود کے لیے تھی،اُسکے پیاروں کے لیے نہیں۔۔۔

اُس رات اُس نے تمام حساب کتاب و جمع تفریق کے بعد یہی نتیجہ اخذ کیا کہ اُسکا خود کو کلینیکل ٹرائل کے لیے دے دینا ہی سب کے حق میں بہتر تھا۔

اصل مسئلہ تو یہ تھا کہ اس ملک سے نکلنے کے لئے وہ گھر والوں سے کیا بہانہ بنائے گا؟

---------+---------+--------

''تم مذاق کر رہے ہو؟ اگر یہ کوئی پرینک ہے تو سن لو نہایت ہی بیہودہ ہے۔'' یہ جملہ ادا کرنے والے حفیظ صاحب تھے۔ لاؤنج میں بیٹھے افراد کو سانپ سونگھا ہوا تھا۔ عمارہ، خضر، اُنکے والدین اُسے بے یقینی سے دیکھ رہے تھے۔ اُسکے چہرے پر مذاق کا شائبہ تک نہیں تھا۔

''میں اس قسم کا مذاق کیوں کروں گا؟ میں نے کافی عرصے سے امریکہ کے لیے اپلائی کیا ہوا تھا۔ وہاں سے جواب آگیا ہے اور مجھے ہر صورت میں اگلے ہفتے وہاں پہنچنا ہے۔'' اُسکا جرمنی کے لیے ویزہ لگ گیا تھا، اُس نے باقاعدہ قانونی طریقے سے اپنے کلینیکل ٹرائل کی منظوری دی تھی، ایمبیسی سے اُرجینسی لیٹر کی بنیاد پر فوراً ویزہ بھی مہیا ہو گیا تھا۔

''تو یہ سب پہلے کیوں نہیں بتایا تھا؟'' خضر مشکوک ہوا۔

''پہلے مجھے خود نہیں یقین تھا کہ اتنی جلدی ہو جائے گا سب۔''

''مجھے کمپنی کا نام بھیجو اور وہ جاب لیٹر بھی۔'' حفیظ صاحب نے کہا تو اس نے سنجیدگی سے دیکھا۔

''میں تفصیل آپ کو میل کر دیتا ہوں۔'' وہ ساری تیاری کر کے بیٹھا تھا۔

''تو اس میں پریشانی والی کیا بات ہے؟ ہم اسی ہفتے شادی کر لیتے ہیں۔ پھر تم چلے جانا اور بعد میں عمارہ کو بھی بلا لینا۔'' اُسکی ماں نے فوراً حل پیش کیا۔ عمر کے گلے میں گلٹی اُبھر کر معدوم ہوئی۔ یہ سب اتنا آسان نہیں تھا جتنا وہ سمجھ رہا تھا۔

''امی! میں اتنے جلدی اسے نہیں بلا سکتا، وہاں چار پانچ لوگ ایک ہی فلیٹ میں رہتے ہیں جو مجھے بھی شیئر کرنا ہو گا۔ اور ابھی اگلے پانچ چھے سال تک تو میں واپس بھی نہیں آسکتا۔ اگر آگیا تو شادی کا سوچیں گے۔'' اُس نے ٹھہر ٹھہر کر بتایا۔

''اور تمہیں لگتا ہے کہ پانچ چھے سال تک میں اپنی بیٹی کو تمہارے انتظار میں بٹھا کر رکھوں گا؟'' اتنی دیر میں پہلی بار عمارہ کے والد نے کہا۔ اس طنز پر باقی سب نے پریشانی سے اُنہیں دیکھا۔

''جیسے آپکو صحیح لگے۔'' یہ جملہ اُس نے کیسے ادا کیا تھا وہی جانتا تھا۔ لیکن وہاں موجود لوگوں کے پیروں تلے سے زمین کھسکی تھی۔

''عمر! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟''خضر کے لیے یہ سب نا قابل برداشت ہو رہا تھا۔

''کیا کیریئر عمارہ سے زیادہ اہم ہے؟''اُسکی والدہ نے پوچھا۔

''تو میں نے کب عمارہ کو چھوڑ دیا ہے؟ میں تو بس پانچ چھے سالوں کا وقت مانگ رہا ہوں۔ کونسا عمر نکل جائے گی اسکی؟ ایسے مواقع بار بار نہیں آتے۔'' یہ عمر نے کہا تھا؟ عمر نے؟ عمارہ کے لیے؟ سامعین کو اپنی سماعتوں پر شک گزرا تھا۔

''بس بہت ہو گیا، تم یہاں سے کہیں نہیں جاؤ گے۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔''حفیظ صاحب کا ضبط جواب دے گیا۔

''معاف کیجئے گا ابو! پر میں آپکے فیصلوں کا پابند نہیں ہوں۔''اُنہوں نے آنکھیں پھاڑ کر اُسے دیکھا تھا۔

''تت۔۔۔ تم۔۔۔ تم پاگل ہو چکے ہو کیا؟'' بے یقینی کی کیفیت میں الفاظ بھی پورے ادا نہیں ہو سکے تھے۔ وہ خاموش رہا۔

''اگر تم اس گھر سے کہیں گئے، تو پلٹ کر واپس مت آنا۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔''اُنہوں نے سخت غضبناک ہوتے ہوئے کہا۔ عمر نے پہلی بار اُنہیں اتنے جلال میں دیکھا تھا، ورنہ وہ نرم مزاج انسان تھے۔

''جیسے آپکی مرضی۔۔۔''وہ سنجیدگی سے کہتا اُٹھ کر باہر چلا گیا۔

''میں اس سے بات کرتی ہوں۔''عمارہ اُسکے پیچھے دوڑی۔

''نہیں عمارہ رکو!''

''عمارہ! جانے دو اُسے۔۔۔ تمہارا کوئی تعلق نہیں اُس سے۔۔۔''

اُسکے ماں باپ نے اُسے پیچھے سے آوازیں دے کر روکنے کی کوشش کی پر وہ نہ رکی۔

''جانے دیں اُسے انکل! کیا معلوم اُسکی بات سن کر فیصلہ بدل لے۔''خضر نے التجا کی۔ حفیظ صاحب تھک کر وہیں بیٹھ چکے تھے۔

''یہ آپ نے ہمارے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ میں نے آپکی خاطر اپنی بہن کو انکار کیا تھا۔ یہ اچھا نہیں کیا آپ نے۔۔۔''عمارہ کے والد کہہ رہے تھے اور حفیظ صاحب شرمندگی سے فرش کو دیکھ رہے تھے۔ اُنکے فرمانبردار بیٹے نے آج اُنہیں زمین میں گاڑ دیا تھا۔

''عمر! عمر!۔۔۔''وہ لان میں کھڑا گہری گہری سانسیں لے رہا تھا جب وہ اُسے پکارتی وہاں آئی تھی۔اُس نے دکھ سے آنکھیں میچ لیں۔وہ اُسے روتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔وہ اپنا فیصلہ نہیں بدلنا چاہتا تھا۔

''عمر! تم کیوں کر رہے ہو ایسا؟ یقیناً کوئی بات ہے ناں! تم کچھ چھپا رہے ہو ناں؟''اُسے کتنا یقین تھا؟اور سچا یقین تھا۔

''میں کچھ نہیں چھپا رہا اور کیا چھپاؤں گا میں؟ جو تھا وہ تمہیں بتا دیا۔یہی سچ ہے۔''اُس نے دیوار پر لٹکتی پھولوں کی بیل کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم میری طرف دیکھ کر بتاؤ ناں!''اُسے اُسکی نظریں چرانے پر غصّہ آیا۔

''عمارہ! میں اپنا کیریئر نہیں چھوڑ سکتا۔تم میرا انتظار کر سکتی ہو تو کر لو،ورنہ جو تمہارے ابّا کہہ رہے ہیں وہ کر لو۔''اُس نے بے دردی سے کہا۔

''بات وہ کرو جسکی کوئی لاجک (منطق) بھی ہو۔تم جھوٹ بھی ٹھیک سے نہیں بول رہے''وہ رو دی۔عمر کچھ نہ کہہ سکا۔

''تم مجھے سچ بتاؤ عمر! تم ایسا۔۔۔''

''بس کر دو عمارہ! بس کر دو۔۔۔''وہ دھاڑا تھا۔زندگی میں پہلی بار وہ ایسے چیخا تھا،اُس عورت پر جس کو کبھی سختی سے دیکھا بھی نہ تھا۔وہ ساکت رہ گئی۔

''میں یہاں اپنے مستقبل کے لیے پریشان ہوں اور تم ہو کہ عام لڑکیوں کہ طرح رونا دھونا مچا رہی ہو۔اگر کچھ کرنا ہی ہے تو جا کر اپنے باپ کو سمجھاؤ۔باہر جا رہا ہوں مر تو نہیں رہا نہ؟ آ جاؤں گا تو ہو جائیگی شادی۔۔۔''عمارہ کتنے ہی لمحے بے یقینی سے اُسے دیکھتی رہی۔یہ شخص تو ملازموں سے بھی چیخ کر بات نہیں کرتا تھا۔تمام آنسو یکدم خشک ہو گئے۔

''میں نے تمہارا بہت انتظار کیا،اپنے ماں باپ کو ہمیشہ تمہارے لیے روک کر رکھا۔میری غلطی تھی جو تم پر بھروسہ کر لیا۔۔۔جاؤ۔۔۔تم اپنا مستقبل بناؤ۔تم نہیں مر رہے پر عمارہ مر گئی تمہارے لیے۔۔۔''وہ روتی ہوئی لان پار کر کے گھر سے نکل گئی۔وہ تنہا کھڑا رہ گیا۔وہ لان جہاں اُسکا بچپن گزرا تھا وہ خالی رہ گیا،وہ دیوار جہاں سے وہ اکثر جھانکا کرتی تھی وہ سونی رہ گئی۔

اُس روز کے بعد عمر اپنے ماں باپ کی نظر میں نافرمان ہو گیا، ایک ہفتے وہ بڑی مشکلوں سے اُن سے نظریں چرانے میں کامیاب ہوا۔ اُسکی ماں اُسکے سامنے بیٹھ کر روتی رہی اور وہ نظر انداز کرتا رہا، خضر نے تو دوبارہ اُسکا منہ ہی نہیں دیکھا۔ امی سے ہی پتہ چلا کہ عمارہ شدید بیمار پڑ گئی ہے، اُسکا بخار ہے کہ اترتا ہی نہیں تھا۔ دل کیا کہ جا کر اُسے دیکھ لے پھر یاد آیا کہ اگر ملنے چلا گیا تو پھر باہر نہیں جا سکے گا۔ اور یہی وہ نہیں چاہتا تھا۔

پھر ہفتے بعد اُس نے اپنا سامان باندھ لیا، خضر اُس سے ملنے نہیں آیا۔ عمر کا بہت دل کیا کہ جانے سے پہلے اُسے گلے لگائے پر وہ اُس سے سخت ناراض تھا۔ وہ جانے سے قبل اپنے دوستوں سے ملنے آیا، آخری بار۔۔۔۔۔ وہ بھی اُسے اتنے ہی پیارے تھے جتنے اُسکے گھر والے۔ پر وہاں کے معاملات ویسے ہی بہت پیچیدہ چل رہے تھے۔ زندگی جیسے یکدم ہی عجیب سی ہو گئی تھی، یا اُسے لگ رہی تھی۔ وہ خود کو بہت لاتعلق ظاہر کرنا چاہتا تھا، پر اُسکی آنکھوں کے نیچے چھائے حلقے اور کمزور ہوتی صحت نے سب کو مشکوک ضرور کیا تھا۔ لیکن کسی نے اُس سے سوال نہیں کیا۔

باپ اور خضر کو ناراض کر کے، عمارہ سے بیوفائی کر کے، دوستوں سے منہ موڑ کے اور ماں کو روتا چھوڑ کے وہ جرمنی کے لیے روانہ ہو گیا۔

ہواؤں میں اپنا راستہ بناتے، جہاز میں بیٹھے ہوئے اُس نے کئی بار سوچا کہ جب اُسکی لاش آئے گی تو تب اُسکے ماں باپ اُسے معاف کر دیں گے؟ تب خضر اُسے معاف کر دے گا؟ تب عمارہ اُسے معاف کر دے گی؟ اور اُسکے دوست؟ اُن پر کیا گزرے گی؟ پر اب وہ فیصلہ کر چکا تھا۔ جرمنی کی حکومت اُسکے کلینیکل ٹرائل کے بدلے سارا خرچ اٹھا رہی تھی، اب وہ پیچھے بھی نہیں ہٹ سکتا تھا۔

---------+---------+--------

سفید روشنیوں کے باوجود بھی کمرہ اندھیرا لگتا تھا۔ آس پاس کھڑے ڈاکٹرز اور نرسیں ہرے رنگ کے لباس میں ملبوس نظر آ رہے تھے۔ اسٹریچر پر لیٹے وجود کے تمام بال کاٹ دیئے گئے تھے۔

"کیا تم مکمل طور پر راضی ہو؟ اگر نہیں ہو تو تم اب بھی فیصلہ بدل سکتے ہو۔ تم پر کوئی زبردستی نہیں ہو گی۔" مریض کے سر پر کھڑے سرجن نے انگریزی میں پوچھا۔

"میں راضی ہوں۔ لیکن۔۔۔۔" مریض رکا۔ اُسکی صحت کافی خراب لگ رہی تھی۔ سوکھ کر جیسے کانٹا ہو گیا ہو۔

''میں کچھ وصیت کرنا چاہتا ہوں۔''اُس نے بات مکمل کی۔

''ضرور! تمہاری وصیت کو پورا کیا جائیگا۔ لیکن مجھے اُمید نہیں، بلکہ یقین ہے کہ تمہاری سرجری کامیاب ہو گی۔''ڈاکٹر نے اُمید دلائی، پر وہ مایوس تھا۔

''میں چاہتا ہوں کہ جب تک میں مر نہ جاؤں، میرے گھر والوں کو اطلاع نہ دی جائے۔ جب میں مر جاؤں تو میری ڈائری میں موجود نمبر پر میرے گھر والوں کو میری موت کی اطلاع دی جائے، اور میرے بارے میں سب کچھ بتا دیا جائے۔ اور میری لاش کو اُنکے حوالے کر دیا جائے۔''اُس کی آنکھیں نم تھیں، آس پاس کھڑا عملہ اُداس ہوا۔

''تمہاری وصیت پر عمل کیا جائیگا۔ کیا تم تیار ہو؟''ڈاکٹر نے اُسکے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا تو اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے سر ہلایا۔ چند ماہ۔۔۔ فقط چند ماہ پہلے ہی کی تو بات تھی۔ اُسکی آنکھوں میں بہت سے منظر گھومنے لگے۔ دیوار پر سے جھانکتی عمارہ، اُسے چھیڑتا خضر، اُسے اپنے ہاتھوں سے نوالے بنا بنا کر کھلاتی ماں، اُسکے ساتھ قہقہے لگاتے اُسکے دوست۔۔۔

زندگی ایک پل میں کیا سے کیا ہو گئی تھی؟ وہاں لیٹے اُس نے اپنی زندگی کے ہر اہم شخص کو یاد کیا تھا، یونیورسٹی کی کلاسیں، سڑکیں اور گلیاں یاد کی تھیں۔ اُنہیں تو معلوم بھی نہ تھا کہ وہ یہاں اکیلا ہے۔ اُسکے جرمنی آنے کے بعد کسی نے اُس سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ وہ لوگ اُس سے شدید ناراض تھے۔

انیستھیسیا کے اثر سے غنودگی میں جاتے عمر کو یہی لگتا تھا کہ اُس نے سب کے لیے بھلا سوچا۔ پر وہ نہیں جانتا تھا کہ زندگی اُسے کیا سبق سکھانے والی ہے۔

---------+---------+--------

جرمنی کے اس ہسپتال میں وہ نرس پچھلے چار سالوں سے اس مریض کی خدمت پر مامور تھا جس سے ملنے نہ کوئی آتا تھا اور نہ ہی کوئی اُسکا پوچھتا تھا۔ پچھلے چار سالوں میں وہ مریض اپنی جگہ سے ایک انچ ہلا، نہ اُس نے کبھی آنکھیں کھولی تھیں۔ یہ میل نرس اُسکے ناخن کاٹتا، اُسکی داڑھی مونچھ، اور سر کے بال تک ٹھیک رکھتا، حتیٰ کہ اُسے کروٹ بھی بدلواتا تھا۔ جب وہ یہاں آیا تھا تو یہ مریض گنجا تھا اور اب اُسکے بال کافی زیادہ ہو گئے تھے۔ عملہ بتاتا تھا کہ وہ کلینیکل ٹرائل کا مریض تھا۔ اُسکا آپریشن کامیاب ہوا، پر وہ کومہ میں چلا گیا تھا۔

پر آج چار سالوں بعد کچھ ہوا تھا، کچھ ایسا جس نے ہسپتال میں ہل چل مچادی تھی۔ڈاکٹرز بھاگ بھاگ کر وہاں آرہے تھے۔وہ صرف آنکھیں کھولے دیکھ رہا تھا۔نہ ہل رہا تھا نہ بول رہا تھا۔شاید وہ کچھ سمجھ نہیں پارہا تھا۔

قصّہ مختصر عمر حفیظ جب ہوش میں آیا تو اُسے پتہ چلا کہ اُسکی زندگی سے چار سال نکل چکے تھے۔چار سال۔۔۔۔چھوٹی بات نہ تھی۔اس انکشاف کو قبول کرنا اُسکے لیے اس قدر مشکل تھا کہ وہ بار بار بے ہوش ہورہا تھا۔ہسپتال کا تقریباً آدھا عملہ اُسکے پاس ہمہ وقت موجود تھا، اخباروں میں کامیاب تجربے کی خبریں شائع ہونے لگی تھیں۔پر عمر حفیظ کے لیے یہ انکشاف بہت خطرناک تھا کہ وہ چار سالوں سے سویا ہوا تھا۔

لیکن اُسکے امتحانات یہاں ختم نہ ہوئے، وہ ہوش میں تو آگیا پر اگلے دو سال وہاں ہسپتال میں ہی رہا، روزانہ اُسکی تھیراپی ہوتی، اُسے چلنا تو دور پاؤں ہلانے میں بھی دقت ہوتی تھی۔اُسکی اسپیچ تھیراپی الگ ہوتی تھی اور سائکیٹرسٹ سے روز اُسکے سیشن الگ۔اُسے مہینوں لگے اس بات پر یقین کرنے میں کہ وہ کومہ میں تھا۔بات کرنے میں اُس نے آٹھ ماہ اور چلنے میں پورا سال لیا اور وہ بھی سہارے کی مدد سے۔

ایک سال بعد جب وہ بولنے اور لکھنے کے قابل ہوا تو جرمنی کے وزیرِ صحت اُس سے ملنے آئے۔اُسے مبارک باد دی اور تحفتاً کافی یورو ز دے کر گئے، اُس کا بینک اکاؤنٹ بھی حکومت نے اپنی جانب سے کھلوادیا تھا۔یہ مہربانی صرف اس لیے تھی کہ اُس نے اپنی جان کا نذرانہ پیش کر کے آنے والوں کے لیے علاج کا راستہ کھول دیا تھا۔وہ غیر مسلم تھے پر احسان فراموش نہ تھے۔

اُن پیسوں سے اُس نے آنلائن لیپ ٹاپ منگوایا، اور کئی دن یہ سوچنے میں لگائے کہ وہ کیا کر سکتا ہے؟ پھر اُس کے ذہن میں فرنیچر ڈیزائننگ کا آئیڈیا آیا۔اُس نے فرنیچرز کے مختلف ویژول امیجز بنانا شروع کیے، یہاں اُسکا بی بی اے بھی کام کر گیا۔۔اُس نے سوشل میڈیا پر اُسکی پروموشن شروع کی، یہاں تک کہ چند مہینوں میں اُسے صرف فرنیچر کی ویژول امیج بنانے کے آرڈر ملنے لگے۔یہ کام اُسکے لیے آسان اور آرام دہ تھا، ڈاکٹر نے بھی اُسے اس کام کی اجازت دے دی تھی۔اب وہ کلائنٹ کی خواہش کے مطابق فرنیچر کی امیج بناتا اور ایک ایک تصویر کے ہزاروں ڈالرز وصول کرتا، اُسے دنیا بھر سے کلائنٹ ملنے لگے تھے۔اُس نے اپنی ویبسائٹ بنوالی، اُسکا پورٹ فولیو مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا گیا۔پر اب وہ یہاں سے نکلنا چاہتا تھا، اُس نے خود پر توجہ دینے اور چلنے پھرنے کی کوششیں تیز تر کر دی تھیں۔اُسے اپنا گھر، دوست اور ملک یاد آتا تھا۔پتہ نہیں سب اُسے یاد کرتے بھی ہوں گے یا نہیں؟ یہ پانچ سال اُن پر کیسے گزرے ہوں گے؟ اُسے یاد

تھا جب وہ ہوش میں آیا تھا۔اُسکے لیے ایسا ہی تھا جیسے کل رات وہ سرجری کے لیے گیا اور صبح وہ ہوش میں آگیا تھا پر ایسا نہیں تھا،اُس رات کے بعد آنے والی صبح چار سالوں پر محیط تھی۔

قصہ مزید مختصر،ایک سال بھرپور محنت کے بعد وہ مکمل صحت یاب ہو کر اُس ہسپتال سے نکلا،اپنا تھوڑا بہت سامان سمیٹا اور پاکستان چلا آیا۔

چھے سال بعد اپنے ملک کی فضاؤں میں سانس لیکر اُس پر عجیب سرشاری کی سی کیفیت طاری ہوئی تھی۔وہاں سب ویسا ہی لگتا تھا جیسا وہ چھوڑ کر گیا تھا۔اُس نے ہوٹل میں روم بُک کروایا اور رات وہیں ٹھہرا،ارادہ تھا کہ صبح گھر جا کر سب کو سرپرائز دے گا۔ہاں! سب ناراض ہوں گے،ابو تو منہ بھی نہیں دیکھنا چاہیں گے پر اس بار وہ سب سچ بتادے گا۔اُس نے دانستہ عمارہ کے بارے میں نہیں سوچا،چھے سالوں میں اُس نے یقیناً اپنا گھر بسا لیا ہو گا۔اُسکے بارے میں سوچ کر خود کو اذیت نہیں دینا چاہتا تھا۔

پر عمر یہ بھول گیا کہ ہمیشہ وہ نہیں ہوتا جو ہم سوچتے ہیں۔

قسمت کھیل کھیلنے میں ماہر ہے۔

اور وہ ہمیشہ جیت جاتی ہے۔

---------+--------+-------

ہوٹل میں سامان رکھ کر اُس نے کھانا بھی ٹھیک طرح سے نہیں کھایا،بس نہیں چل رہا تھا کہ اُڑ کر گھر پہنچ جائے۔بلآخر رینٹ اے کار سے گاڑی کرائے پر لی اور گھر کے لیے نکلا،یہ راستہ اُسے کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔مغرب کی اذانیں ہو رہی تھیں جب وہ وہاں پہنچا،گھر کے باہر اترتے اُسے خوشگوار سی حیرت ہوئی۔پورا گھر برقی قمقموں سے سجا ہوا تھا۔

''بھلا یہاں کیا ہو رہا ہے؟''اُس نے سوچا اور دروازے پر پہنچ کر بیل بجائی،دل زور زور سے دھڑک رہا تھا،جیسے ابھی پسلیاں توڑ کر باہر آجائے۔دروازہ چوکیدار نے کھولا۔

''آپ؟۔۔۔''وہ اُسے غور سے دیکھنے لگا۔

''میں۔۔۔میں اصل میں۔۔۔۔''اُسے سمجھ نہیں آیا کہ اپنے ہی گھر میں آنے کے لیے کیا تعارف دے؟

''آپ عمر صاحب ہے ناں؟ خضر صاحب کے بھائی!'' چوکیدار یکدم ہی پر جوش لہجے میں بولا تو وہ حیران ہوا۔

''ہاں! پر آپکو کیسے پتہ؟''

''ارے! آپ آگئے۔۔۔ آپ۔۔ آپ اندر آئیں ناں! باہر کیوں کھڑے ہیں؟'' وہ کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو رہا تھا، جلدی سے دروازے سے ہٹا اور عمر کو اندر آنے کا راستہ دیا۔

''بیگم صاحبہ اتنا یاد کرتی ہیں آپکو، ہر وقت آپکا ذکر کرتی ہیں۔ آپکی تصویریں بھی دکھاتی ہیں ہمیں۔ کہتی ہیں کہ جب بھی میرا بیٹا آئے اُسے فوراً اندر آنے دینا۔ میں پتہ نہیں کیوں آپکو پہچان نہیں سکا۔۔۔'' وہ بہت باتونی تھا۔ عمر کی آنکھیں نم ہوئیں۔ امی کتنا یاد کرتی ہونگی اُسے؟

''بیگم صاحبہ تو ہر لمحے ذکر کرتی ہیں آپکا، وہ تو بس بڑے صاحب کے ڈر سے۔۔۔'' وہ کہتے کہتے رکا پھر چونکا ''ارے! آپ کا سامان کہاں ہے؟''

''میں سامان بھی لے آؤں گا۔ پر ابھی مجھے اندر تو آنے دو۔'' وہ مسکرایا۔ شاید بہت عرصے بعد۔۔۔

''ہاں! ہاں! آپ آیئے۔۔۔ معاف کر دیجئے گا صاحب! میں بھی بڑا پگلا ہوں۔'' وہ کہتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ عمر مسکرایا، لان کی شکل کافی تبدیل ہو چکی تھی پر وہ جگہ آج بھی ویسی ہی تھی، جہاں خضر ورزش کیا کرتا تھا۔ وہ دیوار بھی وہیں تھی، جہاں سے عمارہ جھانکا کرتی تھی۔ دل میں ایک ہوک سی اٹھی، ماں باپ کو تو وہ منا لے گا پر عمارہ؟

''گھر میں کام اتنے ہیں کہ کچھ یاد ہی۔۔۔'' چوکیدار بولتے بولتے اُسے گھر کے اندر تک لے آیا۔

''صاحب! اب آپ خود اندر جائیں۔ میں پگلا پتہ نہیں کیوں یہاں تک آگیا۔ آپ مہمان تھوڑی ہیں؟ آپکا تو اپنا گھر ہے۔'' اس بار بھی وہ بس مسکرا ہی سکا۔ کھلے دروازے سے گھر کا لیونگ روم نظر آرہا تھا۔ پتہ نہیں گھر کے اندر داخل ہو کر اُسکے دل کی دھڑکنیں اتنی تیز کیوں ہو رہی تھیں؟ عجیب سی گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔

''سنو!۔۔۔'' چوکیدار پلٹ کر جانے ہی لگا تھا جب اُس نے روکا۔

''جی صاحب!''

''یہ گھر کیوں سجا ہوا ہے؟''

''آپ کو نہیں پتہ؟'' وہ حیران ہوا۔

''کیا نہیں پتہ؟'' وہ اُس سے زیادہ حیران ہوا۔

''مجھے لگا آپ تو شادی میں شریک ہونے آئے ہوں گے۔''

''شادی؟ کس کی؟''

''خضر صاحب کی۔۔۔''

''خضر کی؟ ریئلی؟ (واقعی؟)'' وہ خوش ہوا۔

''ہاں! ہاں! صاحب۔۔۔ کل ہی تو ولیمہ ہوا ہے۔''

''کون آیا ہے؟'' یہ آواز کانوں میں پڑتے ہی اُسکے قدم زنجیر ہوئے۔ ماں کی آواز اتنے عرصے بعد کانوں میں پڑی تھی۔ آنسو نہ چاہتے ہوئے بھی آنکھوں میں آنے لگے۔ چوکیدار پلٹ گیا۔

''کون ہے وہاں؟'' اُسکی ماں نے دوبارہ پوچھا تو وہ مزید کھڑا نہ رہ سکا۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا اور اُسکی ماں جو قدم قدم آگے بڑھ رہی تھیں۔ وہ ٹھہر گئیں۔۔۔ تھم گئیں۔۔۔ مجسمہ ہو گئیں۔۔۔

''عو۔۔۔ عم۔۔۔ عمر۔۔۔'' نام ادا ہو گیا۔۔۔

''میرا عمر؟'' اُنہیں یقین نہ آیا۔ وہ تیزی سے آگے آیا۔

''امی!۔۔۔'' اُنکا ہاتھ تھام کر تڑپتے ہوئے پُکارا۔

''میرا بچہ!۔۔۔ میرا بیٹا۔۔۔ میرا عمر۔۔۔'' وہ اُسکے گلے لگ گئیں۔

''عمر!۔۔۔میرا عمر!۔۔۔''تسبیح کی طرح اُسکے نام کا ورد کرتی،اُسکی ماں بلک بلک کر رو رہی تھیں۔اُن کی آنکھیں ترس گئی تھی،اُسکا منہ دیکھنے کے لیے۔ اسکو گلے لگانے کے لیے۔۔۔

''میرا بیٹا!''وہ رو رہی تھیں۔

''ہاں!آپکا بیٹا!''اُس نے روتے ہوئے اپنی ماں کا ماتھا چوما۔

''کہاں چلے گئے تھے مجھے چھوڑ کر؟''اُنکا رونا بند نہیں ہو رہا تھا۔

''بتاؤں گا۔۔۔سب بتاؤں گا۔''اُس نے آنسو پونچھے۔

''تم واپس تو نہیں جاؤ گے ناں؟''اُنکی آنکھوں میں اُمید تھی۔

''نہیں!اگر ابّو ناراض نہیں ہوں تو کبھی نہیں جاؤں گا۔آپ مجھے معاف کر دیں امی!مجھے معاف کر دیں۔''وہ اُنکی ہتھیلیوں پر ماتھا ٹکائے رو دیا۔

''کیا تم معافی کے قابل ہو؟''اس آواز پر اُس نے سر اٹھایا۔حفیظ صاحب سامنے کھڑے تھے،خضر،اُسکا بھائی۔۔۔اُنکے پیچھے کچھ حیران اور کچھ پریشان سا کھڑا تھا۔چھے سالوں میں وہ کافی بڑا ہو گیا تھا۔

حیران عمر اُنکے الفاظ سے نہیں ہوا تھا،اس رد عمل کی تو اُسے پوری اُمید تھی۔پر جس شے نے اُسے حیرت میں مبتلا کیا،وہ تھا عمارہ کے والدین کا وہاں ہونا،وہ آنکھوں میں نفرت سموئے اُسے دیکھ رہے تھے۔وہ خاندانی دوست تھے،پر اتنی بڑی بات کے بعد اُنکا خضر کی شادی کے لیے موجود ہونا سخت حیران کن تھا۔اگر وہ شادی میں شریک ہونے آئے تھے تو واقعی اعلیٰ ظرف تھے۔اُن سے معافی عمر پر فرض تھی۔

''ابّو میں۔۔۔''اس سے پہلے کے وہ کوئی وضاحت دیتا،اُسکی نم آلود سرخ نِگاہیں اندر سے آتے وجود پر پڑیں۔سفید گھر دار فراک پر نک سک سے تیار،دونوں ہاتھوں میں بھر بھر کر مہندی لگائے،عمارہ وہاں اچانک ہی آئی تھی۔عمر کو دیکھ کر اُسکے قدم سست ہوئے،پر وہ رکی نہیں۔۔۔بے تاثر چہرے کے ساتھ چلتی خضر کے برابر آ کھڑی ہوئی۔

عمر نے وعدہ پورا کر دیا تھا، اتفاق ہی صحیح پر وہ چھے سال بعد سامنے تھا ، پورے چھے سال بعد، اُس نے تو جھوٹ کہا تھا، پر قسمت نے سچ کر دیکھایا تھا۔

اُس نے کہا تھا کہ چھے سال بعد آئیگا۔۔۔

وہ آگیا تھا۔۔۔

اور عمارہ نے بھی کہا تھا کہ عمارہ مر گئی تمہارے لیے۔۔۔

اُس نے بھی سچ میں مر دکھایا تھا۔۔۔

اُسکے ہاتھوں کی لگی مہندی پر لکھا نام، دور سے بھی پڑھنے لائق تھا۔۔۔

وہ نام جو اُسکا نہیں تھا۔۔۔

وہ جس نے عمر کے پیروں تلے زمین کھینچ لی تھی۔۔۔

وہ تھا۔۔۔

خضر کی دلہن۔۔۔

---------+--------+-------

میں نے اپنے ہی ہاتھوں، سے گنوایا ہے تجھے۔۔۔

آشنا کوئی اور اب بھی ہے تجھے۔۔

یہ اُسکی زندگی کا ایسا سچ تھا جو اُس نے خوابوں میں بھی نہیں سوچا تھا۔ وہ اُسکی ہاتھوں کی مہندی دیکھنے کے بعد رکا نہیں تھا، وہ چلا گیا۔ وہ الٹے قدموں پلٹ گیا، اُسکی ماں آوازیں دیتی رہ گئیں، باپ نے سختی سے ماں کو روک دیا۔ پر اُس نے پلٹ کر نہ دیکھا۔

یہ تو اس نے نہیں سوچا تھا۔۔۔

عمارہ کسی اور کا گھر بسا چکی ہو گی یہ بات وہ ذہنی طور پر تسلیم کر چکا تھا، پر عمارہ اُسکے بھائی کا گھر بسائے گی، یہ اُس کے لیے نا قابل برداشت تھا۔ اور کتنی بے گانگی تھی اُس کے چہرے پر، جیسے جانتی ہی نہ ہو۔

کاش! میں ایک ہفتے پہلے آ جاتا۔ کاش! دل میں ہوک اٹھی۔

اور اگر ایک ہفتے پہلے آ بھی جاتا تو کیا کر لیتا؟ کیا وہ خضر کو چھوڑ کر مجھ سے شادی کر لیتی؟ ہاں! اگر سچ بتاتا تو شاید۔۔۔ اُس نے سوچا۔ پر اگلے ہی لمحے ضمیر نے ملامت کیا۔ میں ایسا خود غرض کیسے ہو سکتا ہوں؟

مجھے تو ایسا سوچنا ہی نہیں چاہیے، وہ میری بھابھی ہے۔ وہ خود کو ملامت کرنے لگا، پر لفظ **بھابھی** پر دل کٹا تھا۔

''مجھے آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ مجھے نہیں آنا چاہیے تھا! میرے آنے نے اُنکے لیے کتنی پریشانی کھڑی کی ہو گی؟ میں اب گھر نہیں جاؤں گا، کبھی نہیں جاؤں گا۔ میں کسی کو سچ نہیں بتاؤں گا، اگر بتا دیا تو کئی زندگیاں تباہ ہو جائیں گی۔ خضر تو ساری زندگی کے لیے شرمندہ ہو جائے گا اور میں اپنے بھائی پر یہ ظلم نہیں کر سکتا۔'' خضر اور عمارہ دونوں ہی اُسے پیارے تھے۔ اور وہ دونوں ساتھ تھے، درمیان میں تو وہ تھا۔

وہ دوسروں کا سوچتا تھا۔ آج ایک بار پھر اُس نے دوسروں کا سوچا اور اُس لمحے عمر حفیظ نے فیصلہ کر لیا کہ وہ تاحیات اکیلا رہ لے گا، پر کسی کو سچ نہیں بتائے گا۔

---------+---------+--------

''وہ عورت۔۔۔ جسے میرے منع کرنے کے باوجود آپ نے دوبارہ گھر میں آنے دیا۔ اُسے میرے بیٹے کو لیجانے دیا۔ ہاں! وہی عورت ہمیں بیوقوف بناتی رہی ہے۔'' وہ لمبا چوڑا مرد فرش پر بیٹھا بلک بلک کر رو رہا تھا۔ سفیر صاحب نے کانپتے ہاتھوں سے موبائل کھولا اور رپورٹ دیکھی۔ فیٹرنٹی ٹیسٹ پوزیٹو تھا، ڈی این اے ننانوے فیصد میچ کر گیا تھا۔ نشمیہ اُسکی بیٹی تھی، صرف اُسکی۔۔۔ تو پھر وہ رو کیوں رہا تھا؟ وہ حیران ہوئے۔

''دیکھو علی!۔۔۔ وہ تمہاری ہی اولاد ہے۔ تمہاری بیٹی۔۔'' اُنہوں نے نم آنکھوں سے جیسے خوشخبری سنائی۔

''ہاں ابّا! وہ میری ہی بیٹی ہے۔ میری وہ بیٹی جسے میں پیدا ہوتے ہی گود میں نہ لے سکا، وہ بیٹی! جسے میں نے پہلی بار بولتے ہوئے نہیں سنا، اُسے پہلا قدم اٹھاتے نہیں دیکھا۔۔۔ صرف اور صرف اس عورت کی وجہ سے۔ جس نے مجھے دھوکہ دیا، ایک نہیں کئی بار۔ اُس نے مجھ سے جھوٹ کہا کہ میری بیٹی مر گئی ہے۔ اُس نے اتنے عرصے میری اولاد کو مجھ سے دور رکھا۔ اتنا عرصہ تڑپایا مجھے۔۔۔ اتنا عرصہ ابّا!'' اُسکا گلا رندھ گیا۔ سفیر صاحب کو لگا کہ اب وہ بھی رو دیں گے۔ دکھ احساس زیاں کا تھا۔۔۔ تکلیف نارسائی کی تھی۔

''اگر اُسکا شوہر اُسے طلاق نہ دیتا تو شاید!۔۔۔ شاید وہ مجھے کبھی نہ بتاتی اور میں۔۔۔ میں ساری زندگی بے خبری میں مر جاتا۔ میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا ابا! میرے ساتھ ہی کیوں؟'' وہ پھوٹ پھوٹ کے رو دیا۔

اُنہوں نے اُسے آگے بڑھ کر گلے لگا لیا۔ شاید پہلی بار۔۔۔

اس گھر کے در و دیوار نے دونوں باپ بیٹے کو اپنا غم بانٹتے ہوئے دیکھ لیا۔ شاید پہلی بار۔۔۔

اور آج اُنکو روتے دیکھ لیا۔۔۔ شاید۔۔۔

آخری بار؟۔۔۔

---------+--------+-------

آدمی سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے۔ لیلیٰ اُسے نہ ملی، یہ بڑا غم تھا۔ لیکن اپنی ہی چاہت کو بھابھی کے روپ میں دیکھنا؟ یہ اُس سے بھی بڑا غم تھا۔ مقدّم کو سمجھ نہیں آیا کہ اُسے کیا کہے؟

اُسکی بیوقوفی پر اُسے کوسے؟ یا قسمت کی ستم ظریفی پر افسوس کرے؟

وہ واقعی قسمت کے ظلم کا شکار ہوا تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔۔۔ شاید تسلی کے دو بول۔۔۔ پر الفاظ گم ہو گئے۔۔۔

گم ہو گئے پیچھے خاموشی سے چلتے ٹی وی پر نظر آتی خبر کو دیکھ کر۔۔۔

وہ ساکت ہوا۔۔۔

''عمر!۔۔۔''اُس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ٹی وی پر چلتی خبر کو دیکھتے اُسے پُکارا۔عمر نے اُسکی نظروں کے تعاقب میں دیکھا اور اگلے ہی لمحے جھٹکے کھا کر کھڑا ہوا۔فجر کی اذانیں سنائی دے رہی تھیں،سحری سامنے رکھی تھی،اور نیوز کاسٹر کہہ رہا تھا کہ۔۔۔

''سی ٹی ڈی آفیسر،ایس ایس پی نوید عالم کی گاڑی کو چاروں جانب سے شدید فائرنگ کا نشانہ بنایا گیا ہے۔وہ ڈیوٹی سے گھر کی طرف جا رہے تھے جب یہ واقعہ پیش آیا۔واقعے میں نوید عالم شدید زخمی ہوئے ہیں اور اُنہیں زخمی حالت میں ہسپتال۔۔۔۔''

ٹی وی پر چلتی خبر نے اُنکی سانسیں روک دی تھیں۔

---------+---------+--------

(جاری ہے)

نحل کی بارہویں قسط اگلے ماہ کی پندرہ تاریخ کو میری ویبسائٹ اور پیج پر پوسٹ کی جائیگی۔ان شاءاللہ